



[www.sirat-e-mustaqeem.net](http://www.sirat-e-mustaqeem.net)

بارہ خلفاء ۲ بارے میں حضور صلعم کے ارشادات  
صفحہ ۱۲۲ پر بعنوان آیۃ الخفا عشر  
ملکہ فکر و حاشیہ -

آیت خیر البریۃ کا ترجمہ صفحہ ۱۲۳  
۲ آخر میں تکرار کے ساتھ دیکھیں

☆ رشحاتِ قلم☆  
آیت اللہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء

# اصل و اصول شیعہ

☆ ترجمہ، تقدیم اور حاشیہ☆  
مجتہد الاسلام و المسلمین علامہ سید ابن حسن نجفی



ادارہ تمدن اسلام

پوسٹ بکس ۱۳۶۹۸ کراچی (۳۸) فون: ۳۳۳۴۰۴۰



## \* ترتیب \*

\* عرض حال ۹

\* آیۃ اللہ کاشف الغطاء ۱۱

\* حروف و حکایت ۲۵

\* وجہ تالیف ۳۹

شیعیت کی ابتداء اور ارتقاء

\* تاریخ آغاز ۸۱

\* حدیث دیگران ۸۲

\* قتال غور ۸۶

\* معاون اشارے ۸۸

\* رسول کے بعد ۹۰

\* نشر و اشاعت ۹۳

\* سب سے بڑا سبب ۹۸

\* مزید اسباب ۱۰۱

رشحاتِ قلم :

\* آیۃ اللہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء

ترجمہ، تقدیم اور حاشیہ :

\* حجتہ الاسلام والمسلمین علامہ سید ابن نجفی

پیش کش :

\* سید شمس نجفی

نخطاطی :

\* رشید رستم قلم

صورت گیری و اہتمام :

\* سید انصار حسین واسطی

مطالعہ آیاتِ قرآنی :

\* محمد اقبال نعیمی (ریسرچ آفیسر محکمہ اوقاف)

طباعت :

\* المشہد پرنٹنگ اینڈ بیس بی تعاون فضل سنز

ناشر :

\* ادارہ تمدن اسلام • پوسٹ بکس نمبر ۱۳۶۹۸ کراچی ۳۸

جملہ حقوق :

\* بحق ادارہ تمدن اسلام محفوظ ہیں،

اشاعت :

\* ماہ صفر ۱۴۰۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۸۶ء



حضور کو مٹا عقول کے بارے میں

- ۱۰۴ نشان دہی کے لئے دیکھئے ۱۱۴ \* فرزندانِ علیؑ  
۱۰۴ سورۃ حمزہ کے لئے دیکھئے ۱۱۴ \* عبد زین  
۱۰۸ آیت ۱۱۴ سورۃ حمزہ کے لئے دیکھئے \* خلوصِ کامل

### قلبی اعتقاد - زبانی اقرار اور اسلامی ارکان پر عمل کرنے کا نام پیدا ہونے کے لئے دیکھئے صفحہ ۱۱۶

- ۱۱۵ نظری اور عملی مسائل \*  
۱۱۸ حضرت ابراہیمؑ کو امامت عطا ہونا  
دیکھئے سورۃ بقرہ آیت ۱۲۴ \* منصب الہی

### بنیادی نظریات

- ۱۲۸ کلامِ پانی میں پانچ سو قحط \* توحید  
۱۳۱ آیت ۱۲۰ صفحہ ۱۲۰ \* نبوت  
۱۳۳ سورۃ بقرہ آیت ۱۲۰ صفحہ ۱۲۰ \* امامت  
۱۳۹ امامت و خلافت پر احادیث \* وجودِ حجت  
۱۴۶ دیکھئے صفحہ ۱۲۲-۱۲۳ \* عدل  
۱۵۰ موادِ اعظم میں امامت دیکھئے \* معاد

### نظامِ عمل

- ۱۵۵ پیشِ نظر \*  
پیشِ نظر میں امامت دیکھئے صفحہ ۱۲۲-۱۲۳

۱۴۶ نماز \*

۱۴۲ روزہ \*

۱۴۴ زکوٰۃ \*

۱۴۶ خمس \*

۱۸۰ حج \*

۱۸۳ جہاد \*

۱۸۴ { امر بالمعروف اور  
نہی عن المنکر }

۱۸۶ معاملات \*

۱۸۷ بحثِ متعہ \*

۲۰۰ مسئلہ کا واحد حل \*

۲۱۳ طلاق \*

۲۲۱ خلع و مہارات \*

۲۲۳ طہار، ایلا، لعان \*

۲۲۷ وراثت \*

۲۲۷ { وقف، ہبہ  
اور صدقات }

۲۳۰ مقدمات کے فیصلے \*



## عرض حال

آیۃ اللہ شیخ محمد حسنین آل کاشف الغطاء  
۱۹۵۲ء میں مؤتمر عالم اسلامی کے اجتماعات میں شرکت کیلئے  
جب پاکستان آئے، تو کراچی میں قیام کے بعد لاہور کو  
بھی شرفِ قدوم بخشا، اور لاہور کی ایک علمی تقریب میں آپ  
نے حجۃ الاسلام علامہ نجفی سے فرمایا کہ:

"أَصْلُ الشَّيْعَةِ وَأُصُولُهَا كَوَافِرُكُمْ كَقَلَمِ  
أُرْدُو فِيهِ مُنْقَطِعٌ كَرَدِّهِ تَوْبَرًا كَامِ هُوَ جَانِبُ"

نجفی صاحب نے حامی بھری۔ اور انتہائی نامساعد حالات  
کے باوجود کچھ ہی عرصے میں اس بیش بہا کتاب کو اُردو کا  
جامہ پہنا دیا۔

مگر جوں ہی رضا کار بکڈ پونے اس کی اشاعت کی تیاری  
کی، مترجم نے کراچی میں سکونت اختیار کر لی: نتیجہ نہ تو آپ  
دوبارہ مسودہ دیکھ سکے، نہ پروف پڑھنے کا موقع دستیاب ہوا  
اور کتاب چھپ گئی۔ اب اس میں جو کسر رہ گئی تھی، اس کی وجہ سے  
غلطیوں اور خامیوں کا ہونا بالکل قدرتی بات ہے۔

\* ذبح و شکار ۲۳۷

\* خورد و نوش ۲۳۹

### حدود اور تعزیرات

\* حد زنا ۲۴۵

\* لواط اور سحر کی

سزائیں! ۲۴۷

\* تہمت کی سزا ۲۴۸

\* مسکر کی سزا ۲۴۹

\* چوری کی سزا ۲۴۹

\* محارب کی سزا ۲۵۰

\* مختلف سزائیں ۲۵۲

\* قصاص اور دیت ۲۵۳

### خاتمہ

\* مسئلہ بدار ۲۶۱

\* تقیہ ۲۶۵



لیکن اس کے باوجود کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ پاک وہند میں بار بار شائع کی گئی اور دونوں ملکوں میں بیسیوں ایڈیشن نظر آنے لگے! البتہ اس عنوان سے اغلاط بڑھتے گئے، اور کئی زاویوں سے یہ پیش کش بڑی بدقوارہ ہو کر رہ گئی۔

یہ دیکھتے ہوئے ادارہ تمدن اسلام نے فیصلہ کیا کہ اب کتاب پر نظر ثانی کروا ہی لی جائے اور پھر شایان شان طریقہ پر طباعت کا مرحلہ طے پائے۔

بہر حال! ادارے کے کارپردازوں نے حضرت علامہ نجفی کی خدمت میں یہ گزارش پیش کی۔ آپ نے ہماری استدعا قبول فرما کر نہ صرف کتاب کی تصحیح کر دی بلکہ ہر طرح سے اس کی نوک پلک ٹھیک کر کے جگہ جگہ حاشیے بھی لکھے اور ایک نہایت عالمانہ مقدمہ بھی شامل فرما دیا۔

اب یہ اشاعت نئی سچ دھج اور بہت سے اضافوں کے ساتھ قارئین کرام کی خدمت میں پیش ہے۔  
گر قبول افتد خوشا قیمت زہے عرو و شرف!

ادارہ تمدن اسلام

آیۃ اللہ کاشف الغطاء

از: سید شمس نجفی





حلقہ، دریائے فرات کے کنارے عراق کا وہ شہر خواباں  
ہے جس کا پُرانا رشتہ تو بابل *Babylon* کی گلیوں سے  
ملتتا تھا، مگر طلوع اسلام کے بعد اس کی بہاروں میں کچھ  
ایسا نکھار آیا کہ اس بستی کی ہر راہ و منزل نے مذہبِ حق  
کے ایوانِ تمدن کو شمع و گل کا اتنا بڑا، اور لازوال ذخیرہ  
پیش کیا، جسے دیکھ کر دینِ خدا کی تاریخ بھٹوم اُٹھی۔



حلے کے جنوب میں بحناجہ نامی ایک آبادی ہے۔ قدیم زمانے سے اس میں شیخ خضر ابن محمد ابن یحییٰ ابن مطر ابن سیف الدین مالکی لکھ کا کتبہ آباد تھا۔ لیکن بارہویں صدی ہجری میں شیخ خضر اپنے گھرانے سمیت نجف اشرف چلے آئے، اور پھر یہیں ہو رہے!

مولائے متقیان امیر المؤمنین علیہ السلام کے قبۃ مبارکہ کی گھنٹی چھاؤں اور علم و دانش سے چھلکتے ہوئے اس معمورے میں پروردگار عالم نے شیخ خضر کو شیخ جعفر کبیر جلیانہ زند ارجمند عطا فرمایا۔

یہ وہی عظیم دانشور ہیں جنہیں ان کے فقہی شاہ کار "کشف الغطاء" کی نسبت سے کاشف الغطاء کہا گیا۔ اور پھر یہ نام ان کے گرامی مرتبت قبیلے کی پہچان بن گیا!

شیخ جعفر کاشف الغطاء اعلیٰ اللہ مقامہ عرفان و آگہی کا چلتا پھرتا مجسمہ اور اخلاق الہی کی ایک متحرک درس گاہ تھے،

لے اس گھرانے کا تعلق امیر المؤمنین علیہ السلام کے شاگرد رشید "مالک الاشتر" ابن الحارث النخعی سے تھا۔ جس لئے پورا خاندان اپنے آپ کو مالکی کہلانے میں فخر

محسوس کرتا تھا!

صاحبِ مستدرک الوسائل "میرزا حسین نوری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "یوں تو ہمارے تمام علماء اپنے دور میں علم و تقویٰ کی علامت اور آپ اپنی نظیر تھے۔ مگر حرف حق یہ کہ، بزرگ عالی قدر شیخ جعفر ابن شیخ خضر جناب جی نجفی کی بات ہی کچھ اور ہے۔

ممدوح نے اپنی گراں بہا تصنیف کشف الغطاء کے ذریعے قوانین شریعت اور فقہی مشکلوں کو حیرت انگیز حد تک آسان بنا دیا۔ یہ کتاب پڑھنے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی سبک رفتار کشتی نہایت بے تکلفی سے آب و جہاب کو چیرتی ہوئی ساحل مراوے لگ گئی!"

"فقہ و اصول" میں مکاسب و رسائل جیسا تخلیقی کارنامہ انجام دینے والے فخر روزگار، خاتم الفقہاء و المجتہدین شیخ مرتضیٰ انصاری (متوفی ۱۲۸۱ھ) نے اس پیش ہر تصنیف کے بارے میں فرمایا تھا، کہ:

"شیخ جعفر کبیر نے کشف الغطاء میں جن اصول و قواعد پر روشنی ڈالی ہے، اگر کوئی شخص واقعا انہیں ٹھیک سے سمجھ لے تو میں اسے مجتہد مان لوں گا؟"



یہ تو ہونی کتاب کی بات — اب رہی خود صاحب کتاب کی شخصیت — تو اس بارے میں شیخ عبدالحسین تهرانی جو آیۃ اللہ نوری کے استاد تھے، ارشاد فرماتے ہیں :

" شیخ جعفر کے ذوقِ عبادت، گریہ شب، دُعاے

سحر گاہی اور شریعت کے احکام بجالانے کے شوق و

انہماک کو دیکھ کر یقین آنے لگتا تھا کہ جناب امیر علیہ السلام

نے اپنی دل آویز گفتگو سے اخف ابن قیس کے دل و

دماغ کو جس نمونے کے صحیح سلوتر آدمی کا پیکر عنایت

کیا تھا، اس انداز کے بس ! یہی ایک مردِ کامل ہیں !

شیخ جعفر ! استادِ کل اور علمی دنیا کی تاریخ ساز شخصیت

محمد باقر وحید بہبہانی (متوفی ۱۲۵۷ھ) کے شاگردِ رشید تھے۔

اور سید ممدی بحر العلوم (متوفی ۱۲۱۲ھ) جیسے دیدہ و رقیق شناس

ان کی روحانی تربیت میں بھرپور حصہ لیا تھا۔

خود ان کے تلامذہ کرام کی فہرست بھی خاصی طویل

ہے جس میں بیس ہزار صفحات اور تقریباً پچاس جلدوں پر

مشتمل اسلامی قوانین کے دائرۃ المعارف "جواہر الکلام"

کے مؤدبون شیخ محمد حسن نجفی کا اسم گرامی

نمایاں نظر آتا ہے، اور ان حقائق کے پیش نگاہ کسی جھجک کے بغیر یہ کہا جاسکتا ہے کہ شیخ جعفر کبیر کے علمی آثار صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔

" اصل و اصولِ شیعہ " کے مصنف اُسی دُورِ مان

نور و قلم " اور " خاندانِ نور و حکمت کے چشم و چراغ ہیں

جس کے مورثِ اعلیٰ شیخ جعفر کبیر صاحب کشف الغطاء

تھے !

آیۃ اللہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء ۱۲۹۵ھ

مطابق ۱۸۷۶ء مدینۃ العلم " نجف اشرف میں پیدا

ہوئے۔ بنیادی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے کفایۃ الاصول

جیسی گراں بہا کتاب لکھنے والے برجستہ عالم شیخ محمد کاظم

خراسانی متوفی ۱۳۲۹ھ سے اصول فقہ پر عبور حاصل کیا،

فقہی قواعد میں بصیرت حاصل کرنے کی غرض سے پہلے تو

ملا رضا ہمدانی کے حلقہٴ درس میں شامل ہوئے، بعد ازاں

اس دور کے سب سے بڑے قانون دان اور عملی قوانین کے

مثالی مجموعے عروۃ الوثقی کے آفریدگار سید محمد کاظم طباطبائی

(متوفی ۱۳۳۷ھ) کے سرچشمہ فیض سے سیراب ہوتے رہے



”علم حدیث“ میں تبصر حاصل کرنے کے لئے آپ نے مائے ناز بنیاد  
مستدرک الوسائل کے جامع حاج میرزا حسین نوری (متوفی  
۱۳۲۲ھ) کی خدمت میں حاضری دی۔ نیز فلسفے، کلام اور حکمت  
وہنیت پر گرفت مضبوط کرنے کے خیال سے شیخ احمد شیرازی  
میرزا محمد باقر اصطہباناتی اور شیخ محمد رضا نجف آبادی جیسے پایہ  
کے دانش مند اساتذہ سے بہرہ مند ہوتے۔

سید محمد کاظم یزدی طباطبائی اعلیٰ اللہ مقامہ کی رحلت  
کے بعد آیۃ اللہ کاشف الغطاء کو جو بلند مقام بلا نیزین الاقوامی  
پیمانے پر جتنی شہرت حاصل ہوئی وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔  
ممدوح اپنی غیر معمولی ذہانت، مسلمہ زعامت، زبانِ زمام  
شجاعت، سیاسی بصیرت اور اجتماعی شان و شوکت کیلئے بھی  
ضرب المثل تھے۔ اسی طرح تحریر و تقریر میں بھی آپ اپنا جواب  
تھے۔ عربی زبان و ادب پر کاشف الغطاء کو بڑی قدرت  
حاصل تھی۔ ان کی اس خوبی سے متاثر ہو کر شیخ العروبہ —  
احمد زکی پاشا اور امیر البیان شکیب ارسلان نے بھی عقیدت  
کے پھول برسائے ہیں۔ نیز آپ کے خطبات و مقالات اور

پھر آپ کی لکھی ہوئی کوئی اٹھائیس بیش قیمت کتابیں اس کا  
جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔

شیخ محمد بن آل کاشف الغطاء کے سامنے کچھ مقاصد  
تھے۔ اور ان میں سب سے بڑا ہدف دُنیا سے اسلام کی فکری  
آزادی، ذہنی بیداری، سیاسی استقلال، جغرافیائی استحکام  
ہمہ جہتی ترقی، اور ملتِ مسلمہ کا سچا، قدرتی اتحاد تھا۔

بس! اسی غرض کے حصول کے لئے آپ نے ہمیشہ  
”صریحامہ اور نوائے سروش“ کے ساتھ اپنے آپ کو حرکت میں  
رکھا۔ اصل و اصولِ شیعہ ”اسی جذبے کی عکاس! — نیز مغربی  
سامراج کے خلاف کُوت اور نجف کے محاذوں پر تفنگ بردوش  
ہو کر گرم جنگ“ میں علی شہرکت اس عظیم مجاہد کے شعورِ حریت  
کی بہترین ترجمان ہے!

جس زمانے میں استعماری کارندوں نے دینی حلقوں  
کو یہ باور کرا دیا تھا کہ علمائے کرام کے لئے سیاست شجرۂ  
ممنوعہ اور سیاسی حالات کو مرکزِ توجہ بنانا بہت بُری بات ہے!  
اس زمانے میں آیۃ اللہ کاشف الغطاء فرماتے تھے کہ:  
”میں سسر پاؤں تک سیاست میں ڈوبا ہوا ہوں“



سیاست میں حصہ لینا میرا فرض منصبی ہے یہ میری ذمہ داری ہے! اور میں اس سلسلے میں اپنے ضمیر اور اپنے خالق یکتا کے سامنے جوابدہ ہوں۔ آپ اکابر امام معصومؑ کے اس ارشاد گرامی کو دہرایا کرتے تھے کہ:

خداوند عالم نے علماء سے اس بات کا وعدہ لیا ہے کہ: وہ عاجز، کمزور، بے نوا اور فاؤکش عوام کا حال زار دیکھ کر نہ کسی سے سمجھوتہ کریں گے اور نا ہی مصلحتوں کا سہارا لے کر خاموشی روا رکھیں گے!

مرحوم نے اپنے نظریات کی نشر و اشاعت اور اپنے عزائم کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لئے متعدد ملکوں کا دورہ کیا۔ ۱۳۲۸ھ میں آپ فریضہ حج بجالانے کے واسطے حجاز مقدس گئے۔ وہاں سے شام کے لئے رخت سفر باندھا۔ بعد ازاں لبنان کی جانب غریمیت فرمائی۔ یہاں پہنچ کر کچھ عرصے صیدا میں ٹھہرے اور پھر تقریباً دو مہینے تک بیروت سمیت لبنان کے ”صنوبرزار“ میں مختلف شہروں کو فیض پہنچاتے رہے۔ اس کے بعد آپ

مصر تشریف لے گئے، اور کوئی تین ماہ وہاں قیام فرمایا۔ قاہرہ میں جامع ازہر کے دانشوروں اور دوستوں کے ساتھ ملاقاتوں سے آپ نے صرف تباہ و فکروں پر ہی پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ان کی سوچ کو ایک رُخ دیا اور ان کے ذہن کو ایک جہت عطا فرمائی۔

”وادعی نیل“ کے ثقافت خیز ماحول میں اس نابغہ عصر نے جو نمایندہ خطبے دیئے، جو بے نظیر تقریریں کیں، ارباب دانش و بنیاد انہیں علم و ادب کا بہت قیمتی سرمایہ قرار دیتے ہیں۔

۱۳۵۰ھ میں آپ نے فلسطین میں منعقد ہونے والے ”مؤتمر اسلامی“ کے اجتماعات میں شرکت کی اور پھر القدس کے بعد حیفا۔ نابلس اور یافا بھی تشریف لے گئے۔

پس از آں دو سال گزرے ہوں گے کہ آپ پہلی بار ایران کے سفر پر نکلے۔ یہاں آستان قدس رضوی کی زیارت سے مشرف ہو کر مدتوں شیراز۔ کازرون۔ بوشہر۔ آبادان۔ ہمدان اور تہران میں وہاں کے کم و کیف حیات کا جائزہ لیتے رہے۔



دوسری مرتبہ ۱۳۶۶ھ میں آپ نے ایران کا ارادہ کیا۔ اور کچھ وقت شہر کرم میں گزارا۔ نیز تیسری دفعہ ۱۳۶۹ھ میں پھر عازم ایران ہوئے۔ اب کی زندگی کی زیادہ سانسیں مشہد مقدس میں لیں۔ ساتھ ساتھ یہاں کے نامی گرامی علماء و فقہاء سے مذاکرات کئے اور بہت سے اہم مسائل پر بحث و گفتگو کی مجالس میں شریک ہوتے رہے۔

۱۳۷۰ھ میں ایک بار پھر جناب نے شام و لبنان وغیرہ کا قصد فرمایا۔ مگر یہ سفر تبدیلی آب و ہوا کی وجہ سے کرنا پڑا کیونکہ علالت جڑ پکڑ چکی تھی، اور معالج چاہتے تھے کہ غیر معمولی مشاغل سے دور رہ کر، آپ کسی صحت افزا مقام پر آرام فرمائیں! لیکن کاشف الغطاء جیسی ہمہ دل سوز و ہمہ جاں نپیش ہستیوں کے لئے یہ کہاں ممکن ہوتا ہے؟ چنانچہ جلد ہی وطن لوٹ آئے، اور معمول کے مطابق اپنے کاموں میں لگ گئے۔

۱۳۷۱ھ مطابق ۱۹۵۲ء میں حکومت پاکستان کی خصوصی دعوت پر آپ نے موتمر عالم اسلامی کے اجلاس میں شریک ہونے کے لئے نجف سے کراچی تک کی طویل مسافت طے فرمائی

پھر یہی نہیں بلکہ اپنی بیماری اور پیرانہ سالی کے باوجود لاہور، پشاور اور راولپنڈی کے شب و روز دیکھتے ہوئے آزاد کشمیر کے مرکزی شہر مظفر آباد بھی گئے۔

ان تمام مقامات پر، آپ نے جو تقریریں کیں، انھیں مسلمانوں کے سیاسی ادب میں نہایت ممتاز جگہ حاصل ہے۔ آیۃ اللہ کاشف الغطاء کی پوری زندگی اور زندگی کی ہر گھڑی زبان و بیان اور کلک و قرطاس کے ذریعے جہاد کرتے ہوئے گذری۔ اب بھلا ایسے لوگ زیادہ دن کہاں جیتے ہیں؟ چنانچہ جب طبیعت زیادہ بگڑی تو پہلے بغداد جا کر علاج کروایا۔ شروع شروع میں قدرے افاقہ ہوا، اس لئے گھر آ گئے۔ مگر تھوڑی ہی مدت گذری تھی کہ بیماری نے دوبارہ زور باندھا، اور بالآخر بغداد کے الکرخ ہسپتال میں داخل کر دیئے گئے۔ اب کے یہاں بھی مداوانہ ہو سکا، تو ایران کے شہر کرم کی درمان گاہ لیجا گیا لیکن..... رہے نام اللہ کا!

۱۸ ذیقعدہ ۱۳۷۳ھ مطابق ۱۹ جولائی ۱۹۵۴ء، دوشنبہ کا دن تھا کہ فرزند ان توحید دین عقابی روح بگھانے والے بیدار مغزو قائد نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

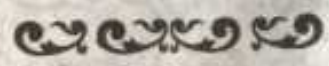


مگر طے شدہ حقیقت یہ ہے کہ جن ہستیوں کی انگلیاں نگار  
اور خامہ نوح چکاں رہا ہو، وہ مرتے نہیں اُمر ہوتے ہیں! ان کی  
زندگی کا ہر نقش پکار پکار کر کہتا رہتا ہے کہ  
ثبوت است بر جریدۂ عالم دوام ما



### مضمون کے مأخذ:

- ۱۔ ریحانۃ الادب ————— حجت الاسلام میرزا محمد علی مدرس
- ۲۔ مالک الاشتہار ————— حجت الاسلام شیخ عبدالواحد ظفر
- ۳۔ فقہای نامدار شیعہ ————— حجت الاسلام عبد الرحیم عقیقی
- ۴۔ ملاح من حیاة کاشف الغطاء ————— استاد محمد شریف آل کاشف الغطاء
- ۵۔ محاضرات ————— حجت الاسلام سید ابن حسن نجفی



### \* حروف و حکایت \*

حجت الاسلام والمسلمین علامہ سید ابن حسن نجفی ★





السلام نے اپنے ابدی منشور میں جس زور و شور سے  
 تمام انسانوں کی تعظیم و تکریم کے خیال کو دنیا سے روشناس  
 کروایا ہے، اسی شد و مد کے ساتھ وحدت اسلامی کا نظریہ بھی  
 پیش کیا ہے۔ مگر، افسوس! کہ طرح طرح کی افتادوں سے ہزرائے  
 میں فرزندِ قرآن "کاشیرازہ بکھرتا ہی رہا! البتہ یہ حقیقت بھی  
 قابل ذکر ہے کہ مختلف ادوار میں پگھلا ہوا دل رکھنے والے کئی  
 دانشوروں نے خدائے یکتا کے ماننے والوں کو تبییح کے دالوں کی



طرح ایک رشتے میں پرونے کی مخلصانہ جدوجہد کی ہے۔ چنانچہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں سرآمد فقہائے روزگار شیخ مرتضیٰ الانصاری رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۲۸ھ) کے نامور شاگرد اور عظیم رہنما سید جمال الدین افغانی (متوفی ۱۳۸۹ھ) نے تتر بتر مسلمانوں کی بکھری ہوئی صفیں سیدھی کر کے انہیں توحید کے جذبے سے سرشار کرنا چاہا، اور بڑے صبر آزما، طاقت ربا، زہرہ گداز حالات کے باوجود خاصی نمایاں کامیابی حاصل کی۔

یقینی بات ہے کہ شہستان بہار رحمت سے آج بھی ان کی رُوح وجد میں آکر کہہ رہی ہوگی ۷

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

پھر بیسویں صدی کے شروع میں آیت اللہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء نے اُس تحریک کی قیادت سنبھالی، جسے جمال الدین افغانی نے اپنے کلیجے کا لٹودے کر زندہ کیا تھا، اور حقیقت یہ کہ کاشف الغطاء نے اس بصیرت افروز جنبش کو دور دور تک پہنچانے اور انتہائی دل آویز بنانے کے لئے اپنی زندگی کی ساری توانائیاں صرف کر دیں ۷

عمر بایک تائیک مرد صاحب دل شود!

”اصل و اصول شیعہ آپ کے ان ہی مساعی جمیلہ کا ایک بیش بہا شاہکار ہے۔

یہ بیش کش محض چند صفحات پر مشتمل روایتی انداز کی کوئی کتاب نہیں، بلکہ کلمہ پڑھنے والوں کے لئے ایک فکر انگیز پیغام، ایک ذہن ساز تحریر، اور اُمتِ مسلمہ میں اتحاد و اخوت کے جذبے جگانے والی ایک نہایت اہم دستاویز ہے۔

مانی ہوئی بات ہے جب تک مسلمانوں میں ایکا نہیں ہوگا اس وقت تک نہ تو ان میں صحیح عالم کو توحید کے نظریے سے سجانے کی سکت پیدا ہوگی اور نہ وہ کُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ ۷

”دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت کے لئے لایا گیا ہے!“

سُورَةُ آلِ عَمْرَان - آیت : ۱۱۰

کے معیار پر پورے اُتریں گے!

قرآن حکیم نے دینِ حق سے وابستگی رکھنے والوں کو حکیم دیا ہے کہ وہ آپس میں گھل مل کر رہنے کی عادت اور متفقہ حکمت عملی اختیار کرنے کی نحوڑ الیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اسلام سے



پہلے کے دور کی جانب توجہ دلاتے ہوئے اس نعمتِ عظمیٰ کی یاد دہانی کروائی ہے جو ٹوٹے ہوئے رشتوں کے جڑنے اور اہل دلوں کے ملنے سے حاصل ہوئی۔ ارشاد ہوتا ہے :

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ

”سب مل کر اللہ کی رستی کو مضبوطی سے تھامے رہو، اور تفرقے میں نہ پڑو! نیز پروردگارِ عالم نے تم پر جو احسان فرمایا ہے، اسے یاد کرتے رہو۔ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دل ملا دیئے، اور اس کی مہربانی سے تم سب بھائی بھائی بن گئے۔ تم دہکتی ہوئی آگ کی بجٹی کے دہانے پر کھڑے تھے۔ اس نے تمہیں اس میں گرنے سے بچالیا۔ اللہ اسی طرح تمہارے

لئے اپنی نشانیاں روشن کرتا ہے، تاکہ تمہیں سیدھی راہ نظر آجائے :

(سورۃ آل عمران - آیت : ۱۰۳)

اب اس کے باوجود جو لوگ خود کو مسلمان کہلوانا ضروری سمجھتے ہیں، لیکن اسلام کے نظامِ اجتماعی کے لئے جو فلسفہ متعارف کروایا گیا ہے، اسے خاطر میں لانے کے لئے تیار نہیں ہیں، کتابِ الہی ان سے یوں خطاب کرتی ہے :

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ

”کہیں! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو تفرقے کا شکار ہو گئے اور واضح ہدایات کے ہوتے ہوئے بھی، اختلافات میں پھنس کر رہ گئے۔ جنہوں نے یہ رویہ اختیار کیا وہ بڑی سخت سزا پائیں گے۔

سورۃ آل عمران - آیت : ۱۰۵



جس دستور حیات میں تفریق و تقسیم سے بچنے پر اتنا زور دیا گیا ہو۔ اور اتحاد و اُتھوت کے بارے میں اس درجہ شرح و تفصیل پائی جائے، اس کے وفاداروں میں تو انتشار، پراگندگی اور افراتفری کا نام و نشان تک نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مگر، صاحب! جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے کہ بات بات پر قرآن اُٹھانے والوں میں اختلاف، آویزش اور تصادم کے سوا، اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔!

خاص طور پر مختلف مکاتب فکر اور مسالک فقہ کے حوالے سے تو یہ قوم ہمہ جاں زحمت و ہمہ تن جراحت بنی ہوئی ہے۔ — اور اس وجہ سے سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ اسلام جو ایک رواں دواں آفاق گیر، انقلابی نظام فکر و عمل تھا، اس کی بارگاہ رک گئی، وہ دلدل میں پھنس کر رہ گیا، پھر ستم بالا سے ستم یہ کہ سیاسی اور معاشرتی قزاقوں نے اسے ایسا لوٹا کہ حلیہ تک بگاڑ ڈالا۔

مقابلے اور بناوٹ، کاٹ، چھانٹ اور آپس کی خدَم خدائے جو عنوان اُبھرے ہیں ان میں شیعہ سُنی مسئلہ سرفہرست رہا، اور ہے — تاریخ سے پوچھئے! اس نام پر دھرتی نے

کتنا خونِ پیاسا ہے۔ فضا میں کتنی آہیں بکھری ہیں اور اوپر سے کیا کیا آفتیں نازل ہوتی ہیں؟ نیز آج بھی، اس روشن دور میں ہاں! ہاں! تسخیرِ ماہِ وانجم کے عہد میں جو صورت واقع ہے وہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہے: کلمہ گویو! ۱۷

کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟  
دُنیا کے بیشتر حصوں میں اہل سنت کی تعداد زیادہ ہے اب یہ قدرتی بات ہے کہ اکثریت میں ہونے کے باعث ان کی ذمہ داریاں بھی قدرے بڑھ جاتی ہیں۔ سیاسی رخ سے دیکھئے یا اخلاقی جہت سے، کم تعداد رکھنے والی جماعتوں کے تمام مدنی حقوق و مراعات کے تحفظ اور نگہداشت کا فرض سوا دِ عظیم MAJORITY ہی پر عائد ہوتا ہے۔

لیکن! دیکھا یہ گیا ہے کہ اور تو اور ان کے باسواد، سمجھ دار اور فعال طبقے نے بھی اس اہم ذمے داری کا بہت کم لحاظ رکھا ہے، اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہر جگہ اور ہر دور میں ذہنی تعارف کا فقدان رہا ہے۔ نیز یہی وہ شکل ہے جو ہمیشہ مفاہمت میں آڑے آتی ہے اور حشر برپا ہوتا ہے۔

دلیل کے طور پر عرض کیا جاسکتا ہے کہ عددی برتری رکھنے



والوں کے تعلیم یافتہ، سنجیدہ اور با اثر اشخاص نے کبھی بھی شیعہ دانشوروں سے ان کے عقائد و مسلمات پر تبادلہ خیال کر کے یا شیعی لٹریچر کے ذریعے مدرستہ تشیع کو ٹھیک سے سمجھنے کی کوشش نہیں کی! نتیجہً جب مفاد پرست عناصر اپنے اغراض مقاصد کے لئے زبان و مسلم کے سہارے افواہوں اور ہوا بیوں کا بازار گرم کر دیتے ہیں، تو یہ ترکیب عوام الناس کو منفی کردار انجام دینے کے ساتھ ساتھ، متین اور موثر ہستیوں کو خاموش رکھنے کے لئے جادو کا کام دیتی ہے! مگر اس تغافل یا تساہل کے سبب اتحاد ملی کا دامن تار تار ہوتا رہتا ہے، معاشرتی زندگی کے بل نہیں بکل پاتے، اور توحید کا نظریہ فریادی ماتم کرنے لگتا ہے

من از بیگانگان ہرگز نہ نالم

کہ ہرچہ کرد با من آشنا کرد

اس خصوص میں شیعوں کے ترجمان اور اسلام کا در و رکھنے والے افراد نے جب کبھی بھی اکثریتی فرقے کے دانش مند حضرات کو اس نکتے کی جانب توجہ دلائی، تو سدا یہ جواب ملا کہ "ہمیں تو شیعوں کا دینی ادب ہی دستیاب نہیں ہوتا۔"

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

الحاصل! آیۃ اللہ کاشف الغطاء، طاب ثراہ تک بھی یہ باتیں پہنچی تھیں۔ لیکن! آپ نے دست تأسف مل کر سکوت اختیار کرنے کے بجائے، غدر و معذرت اور تاویل و توجیہ کے تمام راستے ممکن حد تک بند کر کے نہ صرف اپنی بلکہ تمام شیعہ اکابر کی مقدس تحریک و وحدت اسلامی کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لئے اصل و اصول شیعہ قائم بند فرمادی، اور بہت جلدی ان کی اس عالمانہ اور مخلصانہ کوشش کو قبول عام حاصل ہو گیا بقول غالب

کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مال اچھا ہے!

اصل و اصول شیعہ کا جب پہلا ارڈو ایڈیشن لاہور سے شائع ہوا تو اُس وقت کے صوبائی گورنر میاں مشتاق احمد گورمانی نے رضا کار بک ڈپو کے سربراہ جناب شیخ محمد صدیق صاحب کو ایک خط ارسال کیا، جس میں تحریر تھا:

"شیعوں کے مذہبی خیالات کے بارے میں

خاصے شکوک و شبہات نے مجھے گھیر رکھا تھا مگر

آپ کی طبع کردہ کتاب اصل و اصول شیعہ

پڑھ کر بہت سی باتیں صاف ہو گئیں۔ میں سمجھتا



ہوں کہ میری طرح میرے بعض احباب بھی اس صورت حال سے دوچار ہوں گے۔ اچھا ہے کہ وہ بھی اس کتاب کا مطالعہ کر لیں، تاکہ اگر کوئی بدگمانی ہے تو دور ہو جائے۔ بنابرین کچھ اور نسخے بھیج دیجئے، تاکہ دوستوں کو پہنچا دوں۔“

(یہاں صرف اقتباس دیا گیا ہے۔ اصل خط صدیقی صاحب کی فائیل میں محفوظ ہے)

آیۃ اللہ شیخ محمد حسین آل کاشف الغطاء، اعلیٰ اللہ مقامہ کی تصنیف اختصار کے باوجود اتنی جامع و مانع ہے کہ اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ، ذریعہ کوزے میں بند کرنے کا محاورہ شاید اسی پیش کش کیلئے ایجاد ہوا تھا۔ سچ تو یہ کہ اس دفتر کمال میں ایک جملے کی بھی کمی ہشتی ممکن نہیں! مقدمے میں بہت کچھ عرض کرنا چاہتا تھا۔ مگر کیا کروں؟ آج کل میں عمان میں ہوں۔ اور یہاں کی مصروفیت انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ پھر بار بار سفر کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت بھی قلم ہاتھ میں لئے پاہر رکاب ہوں۔! کراچی، کراچی سے لندن، مینچسٹر، برمنگھم اور ممکن ہے وہاں سے کیلیفورنیا وغیرہ وغیرہ — لہذا ویساچے کے واسطے دانا خیال میں جوچن کر رکھا تھا، زندگی باقی ہے تو انشاء اللہ اسے ترتیب

دے کر ایک مستقل کتاب کی شکل میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔

سہروردت اس معروضے پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہ بیش قیمت مجموعہ جہاں دوسروں کے لئے شیعہ نظریات کے تعارف و تفہیم کا بڑا سنبھلا ہوا اور نہایت مستند وثیقہ Document ہے، وہیں خود شیعوں کے لئے بھی باقاعدہ مسلسل منظم اور مربوط مذہبی دانش و بینش کا ایک خزانہ عامرہ ہے۔

دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے ہو چکے ہیں، اور اہل علم و فضل اس حد تک اس سے مانوس ہیں کہ مختصر ہونے کے باوجود یہ کتاب اب حوالے کی کتاب بن چکی ہے۔ آدھی صدی کی طویل مدت میں، مصر، شام، لبنان، عراق، ایران، تونس اور الجزائر وغیرہ میں، تاریخ مذاہب، فلسفہ ادیان اسلامی عقائد و اعمال نیز مختلف مکاتب فکر و نظر کے تقابلی مطالعے کے عنوان سے جتنی بھی تحریریں سامنے آئی ہیں، بلا مبالغہ ان میں سے سچا نوے فیصد مطبوعات میں اصل و اصول شیعہ کا نام ضرور دیکھا گیا ہے۔

ادارۃ تمدن اسلام کے کارپرداز اے نئی آب و تاب کے



ساتھ پھر سے چھاپ رہے ہیں۔ اُمید کہ اس جدید اشاعت کے سلسلے  
میں ان کے مساعی بار آور ہوں گے۔ دستِ شوق اس ارمغان  
ہمیشہ کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے، اور قدر کی نگاہیں اسے ہر لحظہ دل  
میں جگہ دیں گی۔

بجفی

۱۵ ذوالحجہ ۱۴۰۶ھ  
مطابق ۲۱ اگست ۱۹۸۶ء

وجہ تالیف





دو برس پہلے کی بات ہے، دیارِ مصر سے ایک عراقی طالب علم  
 کا خط آیا۔ مکتوب خاصاً طویل اور اس کا مآ حاصل یہ تھا :  
 ”نامہ نگار نے ”جامعہ ازہر“ کے بڑے بڑے علماء  
 سے تبادلہ خیال کیا، نجف اشرف اور اس دِانشگاہ  
 کے علماء پڑھنے پڑھانے کے طریقوں نیز مشہد  
 علوی کی روشن فضا سے لو لگانے والوں کا بھی ذکر  
 آگیا۔ اس میں شک نہیں کہ قاہرہ کے علمی حلقے

نفعیالہ



”جامعہ عظمیٰ نجف“ کی جی بھر کر تعریف کرتے ہیں اور یہاں کے افاضل کی ذہنی ترقیوں سے بھی کافی متاثر ہیں، مگر اس کے باوجود وہ ہر سٹے یہ ضرور کہتے ہیں۔ ”ہائے افسوس! کہ وہ شیعہ ہیں!“

خط لکھنے والے کا بیان ہے کہ مجھے اس پر بڑا تعجب ہوتا تھا اور اکثر ان حضرات کی سختی میں عرض کرتا تھا کہ صاحبو! شیعہ بھی ایک اسلامی فرقہ اور مسلمانوں کی ایک جماعت ہے۔ مگر اس کا جواب یہ ملتا: کہ نہیں جناب! شیعہ مسلمان نہیں، ”شیعہ“ کو اسلام سے کیا تعلق؟ بلکہ اسے تو مذاہب و ادیان میں شمار کرنا ہی غلط ہے۔ کیونکہ یہ تو ایرانیوں کی ایک اُپج اور اموی حکومت کو عباسی شہنشاہیت میں بدلنے کا ایک سیاسی ڈھونگ تھا، اسے خدا کے بنائے ہوئے راستوں سے کیا واسطہ!

بعد ازاں یہ نوجوان تحریر کرتا ہے: ”جناب والا! میں ابھی کم سن ہوں اور مذہبیات سے بے خبر، نہ مجھے ادیان کے بڑھنے چڑھنے کا فلسفہ معلوم ہے اور نہ ان کے پھلنے پھولنے کی تاریخ سے واقف ہوں۔ بنا بریں کچھ مشکوک پیدا ہو چلے ہیں، اور کیوں نہ ہوں، اس لئے کہ جن بزرگوں سے

مجھے گفتگو کا موقع ملا، وہ بڑے پایہ کے عالم ہیں یہ جملے لکھ کر مصر کی اعلیٰ درس گاہ (ڈگری کالج) کے اس طالب علم نے مجھ سے خواہش کی ہے کہ میں حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھا کر اسے ذہنی کشمکش سے چھٹکارا دلاؤں۔ اس سلسلہ میں اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

”اگر التجار اینکاں گئی، اور میں راہ سے بے راہ ہو گیا تو جناب ذمہ دار ہوں گے!“

چنانچہ میں نے جواب ضروری سمجھا، اور ایک خط میں جتنا مطلب آسکتا تھا، اور اس کی فہم کے مطابق جو مضمون سما سکتا تھا وہ لکھ کر بھیج دیا۔ لیکن واقعہ یہ کہ اس نوجوان کو جتنے شبہات تھے اس سے زیادہ مجھے حیرانیاں!

سوچتا تھا کہ یہ بات کیسے صحیح مان لی جائے مصر جیسا متمدن ملک، اسلامی علوم کا گہوارہ، عربوں بلکہ تمام مسلمانوں کا مرکز نظر اور وہاں کے دانشمندوں کے جہل و عناد کا یہ عالم؟ کسی طرح یقین نہیں آتا تھا، مگر اتفاقاً انہی دنوں مشہور قلم کار احمد امین کی وہ کتاب ہاتھ آگئی جس کا نام ہے ”فجر الاسلام“ میں اس کا مطالعہ کرتا رہا، لیکن جب شیعوں کے حالات تک پہنچا تو رنگ نگارش دیکھ کر یہ محسوس ہوا کہ فاضل مولف کتاب



کیا لکھ رہے ہیں، ہو امیں محل کھڑے کر رہے ہیں۔ عہدِ حاضر میں اگر چین کے دور و دراز علاقوں کا بھی کوئی آدمی ایسی غیر ذمہ دارانہ تحریر پیش کرتا تو اُسے بھی آسانی سے مُعاف نہیں کیا جاتا۔ خیر اس سے مجھے اطمینان ہو گیا کہ عراقی طالب علم نے جو کچھ لکھا تھا، وہ بالکل درست تھا، اور معانی خیال دامن گیر ہوا کہ جب احمد امین جیسے شوقِ تصنیف رکھنے والوں کے ذہن و فکر کا یہ نقشہ ہے تو ناخواندہ یا نیم ناخواندہ عوام کی کیا کیفیت ہوگی؟ حالانکہ وقت کو

۱۹۸۱ء میں مجھے چین جانے کا موقع ملا۔ پکنگ، شنگھائی، کینٹن اور سنکیانگ وغیرہ، جہاں کہیں بھی پہونچا، وہاں بڑے سچھے ہوئے لوگ ملے۔ میں نے شمالی امریکہ، یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بیشتر علاقے دیکھے ہیں، اور تقریباً پوری دُنیا کے مسلمانوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے مگر چین جیسے پیارے مسلمان بہت کم نظر آتے۔

سنکیانگ کے صوبے میں طُرفان نام کا ایک تاریخی شہر ہے، جس میں اکثریت مسلمانوں کی ہے۔ یہاں کے علمائے دین کو اگر مثالی کہا جائے تو کچھ مُبالغہ نہ ہوگا۔

خُتن اور کاشغری وادیاں اسی صوبے میں ہیں جن کے سرسبز و شاداب دامن میں شیعوں کی خاصی آبادی ہے۔

نجفی

دیکھتے ہوئے آج کا ہر مسلمان "وحدت و اخوت" کا حامی ہے۔ نیز اس حقیقت پر یقین رکھتا ہے کہ اگر اُمتِ محمدی کا شیرازہ بکھر گیا تو نہ زندگی بھلی نہ موت! سچ کہتا ہوں اگر ہمارے مسلمان بھائی مَذہبِ شیعہ کی حقیقت سے آگاہ ہوتے، اور انصاف بھی کر سکتے تو ایسے لٹریچر کا وجود ہی نہ رہتا۔ جس سے عداوتِ باہمی کی طرح پڑے۔ نیز استعماری طاقتوں اور بے دین عناصر کی مُرادیں پوری ہوں۔ اب ذرا "فجر الاسلام" کی اس عبارت پر غور کیجئے اور ردِ عمل کا اندازہ فرمائیے:

صفحہ ۳۳۰ پر تحریر ہے:

"حق تو یہ ہے کہ تشیع اسلام کو برباد کرنیوالوں کی پناہ گاہ تھا!"

لکھنے والا نادان نہیں، وہ جانتا ہے کہ نافتِ دوں کے قلم تعاقب کریں گے۔ اور یہ بھی معلوم کہ اس جارحانہ روش سے ایک ایسی قوم کے جذبات مجروح ہوں گے جو کورؤں کی تعداد میں اور اسلامی دُنیا کی بہت بڑی قوت ہے۔

ہاں! یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ گزشتہ سال (۱۳۴۹ھ) میں تیس ارکان پر مشتمل مصر کا جو علمی اور ثقافتی وفد آیا



تھا، اس میں احمد امین صاحب بھی شامل تھے۔ وفد کے تمام ارکان میرے ہاں بھی تشریف لائے۔ رمضان کا مہینہ تھا، رات کا وقت اور بھری ہوئی محفل۔ احمد امین کو دیکھتے ہی فجر الاسلام یاد آگئی۔ کیونکہ یہ کتاب متعدد علماء کی نظر سے گزر چکی تھی۔ چنانچہ ہم لوگوں نے شکوہ کیا مگر بمقتضائے مشرافت بہت دُوبے لفظوں اور اتنے نرم لہجے میں کہ "کہیں ٹھیس نہ لگ جائے آہگینوں کو" اس موقع پر احمد امین نے جو سب سے بڑا عذر پیش کیا وہ تھا "عدم واقفیت" اور کتباؤں کی قلت۔ اس پر ہم نے کہا کہ جناب جب کسی موضوع پر قلم اٹھتا ہے تو پہلے متعلقہ مواد سر اہم کیا جاتا ہے، پھر پوری طرح اس کی چھان بین ہوتی ہے۔ ورنہ قلم کار کو وہ موضوع چھوٹنے کا حق ہی نہیں پہنچتا۔

ملاحظہ فرمائیے! شیعوں کے کتب خانے کیے بھر پور ہیں۔ خود ہمارے ہی مکتبہ کو دیکھ لیجئے تقریباً پانچ ہزار جلدوں پر مشتمل ہے اور اس میں بیشتر کتابیں اہل سنت کی ہیں، پھر یہ علمی ذخیرہ نجف جیسے مختصر سے شہر میں اور مصر اپنی قابل لحاظ وسعتوں کے باوجود شیعہ لٹریچر سے خالی ہے؟

ہاں! یہ لوگ شیعوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے مگر لکھتے سب کچھ ہیں۔ اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ کہ عراق کے برادران اہل سنت پڑوس میں رہتے ہوئے بھی شیعوں سے ناواقف ہیں!

چنانچہ چند ماہ قبل بغداد کے ایک ہونہار شیعہ سید زادے نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ حال ہی میں ضلع ولیم (یہ ضلع بغداد سے متصل ہے) جانے کا اتفاق ہوا اس علاقے کے اکثر باشندے سُنی ہیں۔ راقم نے ان سے میل جول بڑھایا، ان کی محفلوں میں حصہ لیا۔ چونکہ ولیم والے، مجھ "غریب شہر" کے ادب و تہذیب سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے اس لئے انھوں نے آنکھیں جھپکادیں۔ مگر جب یہ معلوم ہوا کہ جس شخص سے دلچسپی لے رہے ہیں وہ شیعہ ہے تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہائیں! شیعہ! علم و تدبیر تو درکنار، ہم تو سمجھتے تھے کہ اس فرقے کے لوگ تمدن اور ثقافت کی معمولی روشنی سے بھی محروم ہوں گے، بالکل جنگلی، بزرے وحشی! — یہ تھے ہمارے بارے میں ان کے تصورات!

خط کے آخر میں، اس نوجوان نے میری حمیت سے خطاب کیا ہے تاکہ میں اپنی قلبی مساعی سے غلط فہمیوں کا



ازالہ کر کے شیعیت کا صحیح تعارف کراؤں۔

کچھ عرصہ بعد یہی نوجوان موسم گرما گزارنے کے لئے شام پہنچا۔ وہاں سے مصر چلا گیا۔ قاہرہ سے اس نے پھر ایک تحریر روانہ کی، جس کا خلاصہ یہ تھا:

”مصر کی حالت بھی ولیم سے مختلف نہیں یہاں

بھی شیعوں کے متعلق وہی خیالات عام ہیں

لہذا التجا کی جاتی ہے کہ جناب اولین فرصت میں

اپنا فرض ادا فرمائیں۔ یقین مانئے! جمہور اسلام

نے شیعوں کی بابت جو خیالات قائم کر رکھے

ہیں، وہ بے حد کریہ ہیں!

پھر اسی پر کیا منحصر! مصر و شام وغیرہ کے جرائد میں آئے دن

جو بہتان تراشیاں ہوتی رہتی ہیں کیا وہ کچھ کم اندوہناک ہیں

حالانکہ شیعوں کا صحیفہ عقائد ”دامن یوسف“ کی طرح بے داغ

ہے۔ مگر جہل و عصبیت کا کیا علاج؟

الغرض ان بدعنوانیوں کے مقابلے میں خاموشی ظلم

صریح کے مرادف بھی۔ لہذا مجھے ادا تے فرض کی جانب متوجہ

ہونا پڑا، مگر یہاں یہ صراحت ضروری ہے کہ نہ تو مجھے شیعوں

کی طرف سے دفاع کرنا مقصود ہے اور نہ سوا د اعظم کی

افترا پردازیوں کا جواب دینا چاہتا ہوں۔ بلکہ سب سے بڑا مدعا یہ ہے کہ عام اسلامی حلقوں سے بے ہالت کی تاریکی دور ہو اور سچائی کے راستے اچھی طرح دکھائی دینے لگیں، نیز عناد رکھنے والوں کے لئے جھٹ پوری ہو جائے اور ایوان تشیع کے نقش و نگار واضح ہو جائیں۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کی باہمی کشمکش کا ازالہ ممکن ہو سکے، تاکہ احمد امین جیسے لکھنے والوں کو پھر کبھی تخریبی کارروائیوں کا موقع ہاتھ نہ آئے۔

”فجر الاسلام“ کے مصنف تحریر فرماتے ہیں: —

”حق یہ کہ تشیع ان لوگوں کی پناہ گاہ تھا جو کینہ

اور عداوت کی وجہ سے اسلام کو برباد کرنے

کے آرزو مند تھے یا پھر ان لوگوں کے سر چھپانے

کی جگہ تھی جو اپنی آبائی تعلیم یہودیت نصرا نیت

اور زردشتیت کا داخلہ چاہتے تھے!“

اس کے بعد ترقیم ہے:

”چنانچہ رجعت کا اقرار یہودیت کا ظہور ہے،

نیز شیعوں کا عقیدہ ہے کہ مجموعی حیثیت سے

آگ ان پر حرام ہے۔“ یہودی بھی یہی کہتے ہیں



لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۖ

(اگر دوزخ کی سزا ہمیں ملے گی بھی تو بس چند روز)

مسیحیت نے یوں جلوے دکھائے کہ بعض شیعوں

نے امام کو ذاتِ باری سے بالکل وہی نسبت

دیدی جو مسیح کے لئے تجویز کی جاتی ہے، اور

یہ بھی کہتے ہیں کہ امام لاہوت اور ناسوت کا

سنگم ہوتا ہے۔ نیز نبوت و رسالت کا سلسلہ

ابدی طور پر ناقابلِ انقطاع ہے، ان کا خیال

ہے کہ جو لاہوت سے پیوست ہو جائے وہ نبی

ہے۔ اس کے علاوہ تنازعِ ارواح، خدا کی تجسیم

اور حلول وغیرہ جو برہمنوں، فلسفیوں اور

مجوسیوں کے قدیمی عقائد ہیں، ایک ایک کر کے

شیعہ مذہب میں نمودار ہوئے، تا آخر!

فضا مگر رہو گی، نیز دنیا ہمیں "واعظ غیر متعظ" قرار دے گی،

اس لئے گفتگو میں تلخی نہیں پیدا کرنا چاہتے۔ ورنہ یہ بتانا بہت

آسان تھا کہ اسلام کو غیر اسلامی طریقے اختیار کر کے بربادی کا

مُنْه دیکھانے والا کون ہے؟ نیز اس وقت بھی وحدتِ دینی

کس کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہے، مگر نہیں!

البتہ صاحبِ فجر الاسلامؒ سے اتنا ضرور دریافت کرینگے

کہ دانشمند محترم! شیعوں کے کس طبقہ نے اسلام کو تاراج کرنے

کی ٹھانی تھی؟ طبقہ اول جس میں سرور کائنات کے چُنے ہوئے

اصحاب ہیں، جیسے سلمان مجتہدی، ابوذر غفاری، مقداد، عمار،

خزیمہ ذوالشہادتین، ابوالقیہان، حذیفہ یمانی، زبیر، فضل

ابن عباس اور ان کے برادرِ عالی قدر عبداللہ ابن عباس، ہاشم

ابن عتبہ مرقال، ابوالیوب انصاری، ابان نیز ان کے بھائی

خالد فرزند ابن سعید ابن العاص اموی، ابی ابن کعب اور انس

ابن الحارث جنھوں نے رسولِ مقبول کو یہ فرماتے ہوئے سنا تھا کہ:

"میرا فرزند حسینؑ اُس زمین پر شہید ہوگا جسے

کربلا کہا جاتا ہے، پس تم میں سے جو بھی اس

حادثے کے وقت موجود ہو، وہ ضرور اس کی

مدد کو پہنچے۔" چنانچہ انس نے دسویں محرم کو



جام شہادت نوش کیا۔ (ملاحظہ ہو الاصابہ

جلد ۱ صفحہ ۱۵۹، اور الاستیعاب جلد ۱ صفحہ ۱۲۳)

زندگانی صحابہ کے موضوع پر یہ دونوں کتابیں سواد اعظم کے مستند ترین مؤلفات میں شمار ہوتی ہیں۔

اگر ہم شیعہ صحابیوں کی فہرست مرتب کرنے لگیں نیز ان کا تشیع ثابت کرنا شروع کر دیں تو اس کے لئے ایک مستقل اور ضخیم کتاب درکار ہوگی۔ پھر علمائے شیعہ کے مناسی جملہ سے اس کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ اس سلسلہ میں التلافی جیسے علمی شاہکار اور طراز اللغۃ جیسے معیاری فرہنگ کے مصنف سید علی خان کا زریں شاہکار الدرجات الرفیعہ فی طبقات الشیعۃ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

اگرچہ کہ مرحوم نے ”طبقات“ میں خاندان ہاشم کے نامی گرامی افراد جیسے حمزہ، جعفر اور عقیل وغیرہ کے بعد صرف مشہور مشہور صحابیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ مثلاً وہ بزرگ جن کے

اس سلسلے میں علامہ سید حسن الامین کی انسائیکلو پیڈیا فی تصنیف اعیان الشیعہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ یہ کتاب ۵۲ جلدوں پر مشتمل ہے جس کی تین جلدوں کا ترجمہ ان کے فرزند رشید اور میرے محترم دوست دانشمند گرامی الاستاذ سید حسن الامین نے انگریزی میں بھی شائع کر دیا ہے۔ (من جہفی)

نام ہم لکھ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ عثمان ابن حنیف سہل ابن حنیف۔ ابوسعید خدری۔ قیس ابن سعد ابن عبادہ رئیس انصار بریدہ۔ برابر ابن عازب، جناب ابن الارث، رفاعہ ابن مالک، عامر ابن وائلہ، ہند ابن ابی ہالہ، جعدہ ابن ہبیرہ مخزومی اور ان کی والدہ۔ ام ہانی بنت ابی طالب اور بلال ابن رباح موذن وغیرہم۔

مگر خیال پڑتا ہے کہ ہم نے اصحاب، اسد الغابہ اور استیعاب جیسے تراجم صحابہ کے مجموعوں سے تقریباً تین سو شیعہ صحابہ کبار کے اسمائے گرامی جمع کئے تھے، اور ممکن ہے کہ کوئی صاحب نظر اس سے بھی زیادہ طویل فہرست مرتب کر لے۔

لیکن اب سوال یہ ہے کہ کیا یہی اکابر اسلام کو برباد کرنے کے آرزو مند تھے یا شیعوں کے امام علی ابن ابیطالب جن کے لئے ثقلین گواہ ہیں کہ اگر وہ بدر واحد اور حنین و احزاب میں اپنی تیغ آب و آہ کو علم نہ کرتے تو نہ شجر اسلام کی کوئی شاخ ہری ہوتی، اور نہ اس کا رخ بلند کا کوئی ستون قائم نظر آتا۔ اسی لئے کہنے والے نے کہا ہے ۷

بنی الدین فاستقام ولولا ضرب ماضیہ ما استقام البناء  
نیز عبد الحمید معتزلی نے تو غلو کی حدیں توڑ دیں۔ فرماتے ہیں:



الا انما الاسلام لولا حسامہ : ان کی تلوار نہ ہوتی .....  
 جی ہاں! اگر ذوالفقار حیدری کی برق باریاں اور ہجرت  
 سے قبل و بعد شیر کردگار کے زہرہ گداز اقدامات نیز مکہ میں  
 مشکل کشا کے والد گرامی حضرت ابوطالب کی پُر زور اوبے لوٹ  
 حمایت، علاوہ ازیں سرزمین حرم اور ارض شریف پر خود علمی تفسی  
 کی غیر معمولی امداد شامل حال نہ ہوتی تو قریش کا سرکش گروہ  
 اور عرب کے خوشخوار بھیڑیے ابتداء ہی میں اسلام کا کام  
 تمام کر دیتے۔

لیکن مسلمانوں نے ابوطالب کے احسانات کا یہ صلہ دیا  
 کہ آپ کو دم آخر بھی مسلمان قرار دینے کے لئے آمادہ نظر نہیں  
 آتے۔ اور اس کے برعکس نبی اکرم کے تمام مصائب کی بنیاد  
 یعنی ابوسفیان کو خلعت اسلام سے نوازنے میں بڑھ  
 چڑھ کر حصہ لیتے ہیں! حالانکہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ اس نے  
 انتہائی جبر و اکراہ کے ساتھ مسلمانوں سے رابطہ قائم کیا تھا۔  
 حضرت عثمان کو جب خلافت نصیب ہوئی ہے تو ابوسفیان ہی  
 نے چیخ کر کہا تھا:

”فرزندانِ امیہ! خلافت کو گیند کی طرح گوج لو

میں جس کی قسم کھا سکتا ہوں اسی کی سو گند کہ  
 نہ بہشت ہے نہ دوزخ!“

بہر حال! جمہور کے فیصلہ کے مطابق یہ زباں دراز تو مسلمان  
 کہا جائے۔ اور ابوطالب! اسلام کا بزرگ ترین معاون جس  
 کے معتقدات کی ایک ہلکی سی جھلک یہ ہے:-

ولقد علمت بأن دین محمد

من خیر ادیان البریۃ دینا

میری دانست میں محمد کا دین یقینی طور پر تمام  
 ادیانِ عالم میں سب سے اچھا دین ہے (ابوطالب)

سُبْحَانَ اللہ! یہ کہنے والا غیر مسلم سمجھا جائے، حالانکہ ابوطالب نہ  
 ایسے بے دست و پا تھے اور نہ اتنے ضعیف الرائے کہ یہ جانتے  
 بوجھتے ہوئے کہ محمد کا دین تمام ادیان سے بہتر ہے۔ پھر بھی  
 اس کی پیروی نہ کرتے اور وہ بھی محض عوام کے خوف سے! واضح  
 رہے کہ آپ بطحا کی تمام قوتوں اور جملہ توانائیوں کا مرکز تھے۔  
 خیر آئیے تھوڑی دیر کے لئے حکایتِ تخریبِ اسلام کا  
 جائزہ لیں۔ اچھا! تو یہ مخرب دین تھے جن کا ابھی تذکرہ ہو رہا  
 تھا۔ یا ان کے بعد کا طبقہ جسے گروہِ تابعین کہا جاتا ہے اور جس



میں اخف بن قیس، سوید بن غفلہ، عطیہ بن عوفی، حکم بن عقیبہ،  
سالم بن ابوالجعد، علی بن جعد، حسن بن صلح، سعید بن جبیر،  
اصبغ بن نباتہ، سلیمان بن مہران، اعمش اور یحییٰ بن یعر  
عدوانی وغیرہم شامل ہیں ان کے بعد تبع تابعین کی وہ سربراہان و شخصیتیں  
ہیں جنہوں نے علوم اسلامی کی تاسیس کی جیسے ابوالاسود دؤلی

واضع علم نحو، حلیل ابن احمد، موجد فرہنگ و عروض،  
ابو مسلم معاذ ابن مسلم الہرار، موسس علم صرف جن کی شیعت  
کا اعتراف سیوطی نے بھی کیا ہے۔ (المزہر جلد ۳)

یعقوب ابن اسحاق عربی ادب کے پیشوا۔ نیز مفسرین کی  
جماعت میں اُمت کے عظیم دانشور جناب عبداللہ ابن عباس  
کا اسم گرامی سرفہرست ہے اور ان کا تشیع مہر نیم و سہ بھی  
زیادہ روشن ہے۔ ان کے بعد جابر ابن عبداللہ انصاری  
ابی ابن کعب، سعید ابن جبیر، سعید ابن المسیب اور علوم  
قرآن کے اولین جامع محمد ابن عمر واقدی کے نام آتے ہیں  
ابن ندیم وغیرہ نے ان کے شیعہ ہونے کا اقبال کیا ہے  
الرغیب واقدی کی تفسیر ہے۔

علم حدیث کی بنیادیں رکھنے والوں میں سرکارِ رسالت

کے آزاد کردہ غلام اور کتاب الاحکام والسنن والقضایا  
کے مصنف ابورافع ہیں۔ یہ امیر المومنین علیہ السلام سے  
خصوصی ربط رکھتے تھے۔ نیز حضرت کے دور حکومت میں  
مرکزی خزانہ عامرہ کے معتمد مالیات تھے، ان کے فرزند  
بھی اسی سلسلے کے دو نمایاں افراد ہیں۔ علی ابن ابورافع  
امیر المومنین علیہ السلام کے سیکریٹری تھے۔ یہ پہلے شخص  
ہیں جنہوں نے اپنے باپ کے بعد فقہ میں تصنیف کا کام کیا  
اور ان کے بھائی عبداللہ ابن ابورافع نے تاریخ و وقائع نگاری  
کی بھی طرح ڈالی۔

جن حضرات نے علم کلام کی عمارت کھڑی کی ان میں  
ابو ہاشم ابن محمد ابن حنفیہ کو اولیت حاصل ہے۔ اس  
موضوع پر ان کی متعدد جلیل القدر کتابوں کا نشان ملتا  
ہے پھر عیسیٰ ابن روضہ تابعی کے کارنامے سامنے آتے  
ہیں۔ واضح رہے کہ مذکورہ اعظم و اصل ابن عطاء اور  
ابو حنیفہ سے بھی پہلے گذرے ہیں۔ اس ضمن میں سیوطی کا  
یہ خیال درست نہیں کہ مؤخر الذکر علم کلام کے اولین مصنف  
تھے۔ بعد ازاں مشہور شیعہ اکابر کا دور آتا ہے جن میں قیس  
الماصر، محمد ابن علی اسول معروف بمومن طاق، ہشام ابن حکم



اور آل نوبخت شامل ہیں۔ یہ گرامی مرتبت خاندان سو سال سے زیادہ عرصہ تک مذہب و ملت کی خدمت انجام دیتا رہا۔ ان کے مصنفات میں "فصل الیاقوت" وغیرہ کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ نیز ہشام، اہول اور الماصر کے تلامذہ ابو جعفر سکاک بغدادی، ابومالک ضحاک خضرمی، ہشام ابن سالم، یونس ابن یعقوب وغیرہم کے اسماء گرامی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ یہ وہ ہستیاں ہیں جنہوں نے "دہریوں" سے تبادلاً فکر و نظر کر کے انہیں زبردست ذہنی تکتیں دیں اور توحید و امامت جیسے عناوین کے لئے نا قابل تردید ثبوت مہیا فرمائے۔

اگر کوئی شخص ان حضرات کے جملہ کلامی مباحث کو جمع کرنے کی کوشش کرے جو ہمارے علمی ذخیروں کی زینت ہیں تو ہر متکلم کے افادات کے لئے ایک مستقل کتاب چاہیے خصوصاً ہشام ابن حکم کے مناظرات! اسی طرح اگر ہم تمام شیعہ فلاسفہ اور متکلمین کا شمار کرنا چاہیں تو کئی ضخیم جلدیں مرتب ہو جائیں گی۔

اب فرمائیں فجر الاسلام کے مصنف کہ یہ لوگ دین خدا کی تباهی کے خواہشمند تھے یا وہ ہوش مند تھے جنہوں نے

سیر و آثار کی حفاظت میں رات دن ایک کر کے حضور حتمی مرتبت کی زندگی، معجزے، غزوات اور حسن کردار کے نمونوں کو جمع کرنے کی سعی فرمائی؟ اس زمرے میں عالم اسلامی کی پہلی شخصیت ابان ابن عثمان الاحمر تابعی (متوفی ۱۲۰ھ) یہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے شاگرد تھے۔ ان کے بعد ہشام ابن محمد، محمد ابن سائب کلبی، محمد ابن اسحاق مطلبی اور ابو مخنف ازدی کے شاہ کار سامنے آتے ہیں۔ بعد کے تمام لکھنے والے اس فن میں ان کے محتاج رہے۔ مورخین کی فہرست پر نگاہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کل بلند پایہ قلم کار شیعہ تھے۔

مثلاً "کتاب المحاسن" کے مؤلف احمد ابن محمد ابن خالد برقی، نصر ابن مزاحم منقری، ابراہیم ابن محمد ابن سعد تقنی، عبدالعزیز جلوہ بصری امامی، احمد ابن یعقوب جن کی تاریخ "الیعقوبی" یورپ میں شائع ہو چکی ہے محمد ابن زکریا، ابو عبداللہ الحاکم "مروج الذهب" کے مصنف "المسعودی" آداب السلطانیہ کے مؤلف محمد ابن علی ابن طباطبایا اور ان جیسے سینکڑوں افاضل ہیں جن کے شمار کا موقع نہیں۔



پھر مشہور ادباء کا جائزہ لیجئے تو ان میں بھی شیعوں ہی کو اکثریت حاصل ہے۔ اربابِ سخن کے مختلف طبقے ہیں۔  
پہلا طبقہ :

اس میں زیادہ تر اصحاب ہیں، اور اس سلسلے کے جتنے مشہور سخن سنج ہیں وہ سب کے سب تشیع سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر نابغہ جعدی۔ یہ صاحب ذوالفقار کے ساتھ جنگ صفین میں شریک ہوئے اور اس معرکہ میں جو رجز کہے ہیں وہ کافی شہرت رکھتے ہیں۔ عروہ ابن زید الخلیل انھوں نے بھی حضرت زکے کے ساتھ صفین میں شریک کی تھی (ملاحظہ ہو الافغانی) لبید ابن ربیع عامری ادباء کی ایک بڑی جماعت نے ان کی شیعیت کا اقرار کیا ہے۔ ابوطیف عامر ابن وائلہ ابوالاسود دؤلی۔ اور بابت سعد کے مصنف کعب ابن زہیر و امثالہم۔

دوسرا طبقہ :

تابعین کا معاصر ہے۔ اس جماعت میں فرزوق کبیت کثیر عرہ، سید حمیری اور قیس ابن ذریح وغیرہم کو بہت اونچا مقام حاصل ہے۔

تیسرا طبقہ :

دوسری صدی ہجری سے متعلق ہے۔ اس میں عجل خزاعی، ابونواس، ابوتمام، بختری، دیک الجن، عبد السلام ابوالشیص، حسین ابن ضحاک، ابن رومی، منصور نمری، ابی سلی، محمد ابن وہب اور صریح الغوانی کو جو شہرت نصیب ہوئی وہ محتاج بیان نہیں۔ نیز مروان ابن ابی حفصہ اور اس کی ذریت کو چھوڑ کر عباسی دور کے تمام بڑے ادیب شیعہ ہی تھے۔ اسی طرح چوتھی صدی ہجری کے مشاہیر مثلاً مغرب کے ابن ہانی اندلسی، ابن التعاویذی صاحب مجون حسین ابن الحجاج، ہیار دلمی اور امیر الشعراء، ابوفراس حمدانی جن کی بابت یہاں تک کہا گیا ہے کہ "شعر کی ابتداء بادشاہ سے ہوئی اور خاتمہ بھی بادشاہ پر ہوا" نیز کتاجم، ہاشمی صغیر ناشی کبیر، ابوبکر خوارزمی، بدیع ہمدانی، طغرانی، شمس الخلافہ جعفر، عمارہ یمنی، وداعی، زاہبی، ابن بسام بغدادی بسط ابن تعاویذی سلامی اور نامی بلکہ یتیمۃ الدہر تعالبی (جو چار جلدوں پر مشتمل ہے) کے بیشتر اساتذہ فن شیعہ ہیں۔ حقیقت یہ کہ اصناف ادب میں شیعوں نے اتنا عروج حاصل کیا کہ سخن شناسوں کو یہ کہنا پڑا کہ :



”کیا شیعوں کے علاوہ بھی کوئی ادیب ہوتا ہے؟“

نیز تحبین کلام کے سلسلے میں یہ کہاوت تو عربوں میں عام ہو گئی تھی کہ: ”وہ مخنور تو اپنے شعر سے بالکل شیعہ لگتا ہے“ کچھ لوگوں نے متنبی اور ابوالعلا رکو بھی شیعہ لکھا ہے۔ نیز سند کے طور پر ان کے بعض اشعار کا بھی حوالہ دیا جاتا ہے۔  
(ملاحظہ ہو المراجعات الرسخانیہ جلد ۲)

ہاں ان طبقوں میں خاندان قریش کے شیعہ شعراء جیسے فضل ابن عباس جن کے حالات الانافی ”میں درج ہیں، ابو ذہیل جمحی، وہب ابن ربیعہ علاوہ ازیں خاص علوی ادیب بھی مثلاً شریف رضی و مرتضیٰ، شریف ابوالحسن علی حماتی فرزند شریف اور محمد ابن جعفر ابن محمد ابن زید ابن علی ابن الحسین علیہم السلام کے اسمائے گرامی شامل نہیں ہیں۔

شریف حماتی فرماتے تھے: ”میں شاعر میرے باپ شاعر، میرے دادا شاعر“ محمد ابن صالح علوی نہایت بلند مرتبہ ادیب تھے۔ ابوالفرج اصفہانی نے ممدوح کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے گراں مایہ نتائج منکر کا بھی تعارف کروایا ہے۔ اسی طرح شریف ابن شجر و غیر یہ

سب علوی سلسلہ کے ممتاز ہمنمند ہیں۔ مزید تفصیل کے لئے ”نہمة السحر من تشیع و شعر“ کا مطالعہ مفید ہوگا، شریف یمانی کے اس وقیع شاہ کار میں نہ صرف علوی ادیبوں ہی کا خاطر خواہ تذکرہ ہے بلکہ اموی گھرانے کے شیعہ شعراء کے حالات بھی موجود ہیں۔ مثلاً عبدالرحمن ابن حکم، خالد ابن سعید ابن عاص، مروان ابن محمد مروجی اموی جن کا ذکر کرتے ہوئے زرخشری نے اپنی کتاب ”ربیع الابرار میں غالباً یہ ابیات بھی درج کئے ہیں:-

یا بنی ہاشم ابن عبدمنہ اننی منکم بکل مکان  
انتم صفاۃ الالہ ومنکم جعفر ذوالجناح والطیران  
وعلی وحسنہ اسد اللہ و بنت النبی والحسنان  
ولئن کنن من امیۃ انی لبرئ منہم الی الرحمن  
◆ ”اے آل ہاشم ابن عبد مناف میں جہاں بھی ہوں تمہارا ہوں۔“

◆ ”تم خاصان خدا ہو، اور جعفر طیار تمہارے ہی کنبے کے بلند پرواز فرد ہیں۔“

◆ ”علی شیر کردگار، حمزہ، و خیر رسول اور حسنین تمہارے ہی خاندان کی شخصیتیں ہیں۔“



♦ ہاں! میں اگرچہ کہ اموی نژاد ہوں لیکن حاشا! کھینچتا ہوں کہ مجھے بنو اُمیہ سے کوئی واسطہ نہیں!

اسی طرح نجدیات و عراقیات کا شہرت یافتہ مصنف ایوبی کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ ان کے علاوہ اس سلسلے کے اور بھی بہت سے مشاہیر ہیں مگر چونکہ یہ کتاب قلم برداشتہ لکھی جا رہی ہے، بنا بریں سب کے حال احوال کی تشریح مشکل ہے۔

نیز جب بڑے بڑے فرماں رواؤں، عظیم سیاستدانوں اور مدبر وزراء کی تاریخ سامنے آتی ہے تو یہاں بھی شیعہ پیش پیش نظر آتے ہیں۔ فاطمی اور بویہ حکمرانوں کے علاوہ آل حمدان، بنی مزید، بنی دبیس، عمران ابن شاہین، مقلد ابن مسیب عقیلی اور قرواش ابن مسیب جیسے سلاطین شیعہ ہی تھے۔ نیروجیہ الدولہ ذوالقرنین تغلبی اور مغرب و افریقہ کے فرماں روا تمیم ابن معز کی شیعیت بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اس فہرست میں بھی مزید بہت سے نام آسکتے ہیں۔ اور وزراء کی صف میں تو سب شیعہ ہی شیعہ دکھائی دیتے ہیں۔ اسحق کاتب، غالباً یہ پہلے شخص ہیں جن کے لئے رسمی طور پر وزیر کی اصطلاح استعمال کی گئی۔ ابوسلمہ خلّال کوئی، یہ پہلے عباسی خلیفہ کے پہلے وزیر تھے۔ سقاج نے ان کی

انتظامی قابلیت کے پیش نظر سلطنت کے جملہ امور حوالے کر دیے تھے۔ ابوسلمہ نے وزیر "ال محمد" کے لقب سے شہرت پائی لیکن پھر آل محمد کی دوستی ہی کے باعث سقاج کے سفاک ہاتھوں سے شہید ہوئے۔ ابوعبد اللہ یعقوب ابن داؤد مہدی عباسی کے وزیر تھے، خلیفہ نے پورا نظم و نسق ان کو سونپ دیا تھا۔ یہ شعرا انھیں کے متعلق ہے۔

بنی اُمیہ ہبوا طال نومکم

ان الخلیفۃ یعقوب ابن داؤد

♦ "بنی اُمیہ! اٹھو، خواب گراں سے بیدار ہو۔ دیکھو اب خلیفہ یعقوب ابن داؤد ہے!"

آخر میں انھیں بھی زندان کی صورت دیکھنا پڑی آل نوحجت اور بنی سہل تو وزارت کے گھرانے ہی کہلاتے ہیں۔ فضل ابن سہل، حسن ابن سہل، مامون رشید کے وزراء تھے۔ اسی طرح بنو الفرات میں سے حسن ابن علی دور مقتدر میں تین مرتبہ وزارت کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ابوالفضل جعفر ابوالفتح فضل ابن جعفر اور فرزند ابن عمید محمد ابن حسین اور ان کے بڑے بیٹے ذوالکفایتین، ابوالفتح علی ابن محمد بن الدولہ کے وزیر تھے۔ طاہر جزاعی کی اولاد کو مامون نے وزارت سپرد کی۔



مہتممی، ابو دلف عجمی، صاحب ابن عباد اور عظیم سیاستدان ابو القاسم وزیر مغربی۔ ابو عبد اللہ حسین ابن زکریا جو شیعی کے لقب سے شہرت رکھتے ہیں، ان کے سوا ابراہیم صولی طلائع ابن زریک، مصر کے سپہ سالار افضل اور ان کے فرزند ابو الحسن جعفر ابن محمد ابن فطیر، ابو المعالی ہبۃ اللہ وزیر مستنصر اور موید الدین محمد ابن عبد الکریم قتی پہلے ناصر کے، پھر طاہر کے وزیر ہوئے۔ اس کے بعد مستنصر نے وزارت پیش کی جن ابن سلیمان برامکہ کے عہد میں چیف سیکرٹری Chief Secretary تھے۔ یہ بھی شیعی کے لقب سے مشہور ہوئے۔

نیز مصنف الاوراق صولی، یحییٰ، ابن سلامہ حنفی اور صاحب فہرست ابن ندیم کی تحریر کے مطابق ابو جعفر احمد ابن یوسف اور ان کے بھائی ابو محمد ابن قاسم کے اہل بیت کی شان میں کھے ہوئے قصائد و مرثی آپ اپنی نظیر ہیں اور ملاحظہ ہو صولی کی الاوراق۔ یہ مامون کے زمانے میں معتمد عمومی تھے بلکہ اس کے بعد کے دور میں بھی یہ عہدہ ان کے پاس رہا اسی طرح ابراہیم یوسف اور ان کے فرزند نیز عربی زبان کے ناخدا اور معجم کے مصنف ابو عبد اللہ محمد ابن عمران مہربانی

کا نام بھی یاد رکھنے کے قابل ہے۔ بمعانی نے ان کے تشیع کا ذکر کیا ہے۔ وعلیٰ هذا القیاس، سینکڑوں ہستیاں ہیں جن کی انتظامی قابلیت، سیاسی بصیرت اور قومی خدمات کا ریکارڈ Record پیش کرنے کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہیں۔

ہمارے والد علام نے شیعوں کے مختلف طبقوں کے حالات جمع کرنے کی کوشش فرمائی تھی، چنانچہ دس جلدوں میں علماء، حکماء، سلاطین، وزراء، ہیئت داں اور اطباء وغیرہ جیسے تیس طبقوں پر حروف تہجی کے مطابق روشنی ڈالی ہے، اس مجموعہ کا نام ہے الحصون المنیعہ فی طبقات الشیعہ مگر حق یہ کہ یہ ضخیم تالیف بھی جامع نہیں۔

اس منزل پر پھر ہم صاحب فخر الاسلام سے دریافت کریں گے کہ آپ کے خیال میں یہی حضرات جنہوں نے معارف اسلامیہ کو پروان چڑھایا، اور علم و دانش کو استحکام بخشا۔ دین متین کو منہدم کرنے کے درپے تھے؟ اور پھر یہ سوال کہ آپ اور جناب کے استاد ڈاکٹر طہ حسین مذہب اسلام کے حامی ہیں؟ اگر یہی صورت حال ہے تو اس زندگی پر صد حیف اور اسلام کو



سلام! بلکہ بقول شاعر جب حاتم کو بھی بخیل کہا جانے لگے تو بہتر ہو گا کہ ع

موت آجائے، کہ قصہ پاک ہو!

حقیقت یہ ہے کہ مدعائے تحریر یہ نہ تھا۔ لیکن حاتم چل پڑا اور بہت ہی باتیں بیچ میں آگئیں۔ لیکن شاید حال و استقبال کے اہل قلم اس سے کچھ متاثر ہوں اور کم از کم ان میں تحریر کا سلیقہ اور جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اس کے اظہار کی صلاحیت آجائے۔

حکیم اسلام حضرت علامہ ابن ابی طالب علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں :

”دانش مند کی زبان اس کے دل کی تابع ہوتی ہے اور جاہل کا دل اس کی زبان کا فرماں بردار ہوتا ہے“

احمد امین کا یہ قول کہ ”رجعت کے عقیدہ سے تشیع میں یہودیت نے ظہور کیا“ انتہائی اندوہناک ہے۔ کاش! وہ بتا سکتے کہ رجعت شیعوں کا کوئی اساسی مسئلہ ہے یا ان کے مذہب کا کوئی بنیادی رکن جسے نکتہ چینی کا موضوع بنایا گیا ہے؟ کسی فرقے کے بارے میں جس کسی کی بھی معلومات کا یہ عالم ہو تو کیا اس کے لئے یہ

مناسب نہیں کہ وہ سکوت اختیار کر کے اپنا بھرم قائم رکھے۔ واقعہ یہ کہ عقیدہ رجعت لازماً تشیع نہیں۔ البتہ اس کا اقرار ضروری سمجھا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے تمام اسلامی حلقوں میں اخبار غیب، علامات قیامت مثلاً حضرت عیسیٰ کی آمد اور خروج دجال وغیرہ کا اعتبار ہے۔ لیکن نہ یہ باتیں عین اسلام ہیں نہ ان کا انکار اسلام سے خارج ہونے کا سبب اور نہ ہی ان کا مجرد اعتراف کسی کے مسلمان ہونے کی دلیل ہے۔ یہی کیفیت عقیدہ رجعت کی ہے نیز اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ اس کا تعلق شیعوں کے اصول سے ہے تو کیا کسی یہودی مسئلہ سے اتفاق کو یہودیت سے اثر پذیر ہونے کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے؟ مسلمان توحید کے قائل ہیں۔ یہودی بھی ایک ہی معبود کی پرستش کرتے ہیں۔ تو کیا اس اشتراک خیال سے اسلام کو یہودیت سے وابستہ کرنے کی جرات کی جاسکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔

اس عقیدے کے سلسلہ میں مطعون کرنے والوں کو نہ معلوم کیا غیر معمولی شے نظر آتی ہے، جو اس درجہ جذباتیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

”خداوند عالم ایک گروہ کو دوبارہ زندگی عطا کرے گا۔“



یہ کون سا محال کام ہے؟ کیا کسی نے کلامِ الہی میں یہ قصہ کبھی نہیں پڑھا؟

الْمَرْتَرِ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ  
وَهُمُ الْوَفَّ حَذَرَ الْمَوْتِ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ  
مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ ۚ

”کیا تم نے ان لوگوں کے حالات پر غور نہیں کیا جو موت کے ڈر سے ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے بکل کھڑے ہوئے تھے! لیکن خدا نے کہا مَرَجَاؤَ اور انہیں موت آگئی۔ اس کے بعد پھر اس نے انہیں زندگی بخش دی۔“

اور یہ آیہ کریمہ بھی کسی کی نظر سے نہیں گزری؟

وَيَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ فَوْجًا ۚ  
(اور جس دن ہم ہر امت سے ایک گروہ کو اٹھائیں گے)

اگر اس سے مراد قیامت لی جائے تو قیامت کے روز تو ہر قوم سے ایک گروہ نہیں بلکہ تمام امتیں محشور ہوں گی!

یہ آج کی بات نہیں۔ علمائے جمہور صدرِ اول ہی سے اس

۱۰ البقرہ، پ. ۱۰ آیت: ۲۴۳

۱۱ النمل، پ. ۱۰ آیت: ۸۳

مسئلہ کو ہدفِ ملامت قرار دیتے چلے آئے ہیں۔ بلکہ اس ضمن میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ جب وہ کبھی جلیل القدر شیعہ اوی یا محدث کے اعتبار و اعتماد کو مجروح کرنے کا کوئی موقعہ نہیں پاتے تو کچھ اس انداز سے رجعت کا اہنادینے لگتے ہیں جیسے کسی پرست پرستی یا شرک کا الزام لگایا جا رہا ہو۔

زیر بحث معاملہ میں مومن طاق اور ابو حنیفہ کا واقعہ خاصی شہرت رکھتا ہے۔

بہر حال میرے نقطہ نظر سے یہ امر اتنی اہمیت نہیں رکھتا کہ اسے ثابت کرنے کی جدوجہد کی جائے چنانچہ غلط اندیش لوگوں کی صفِ مذہبی بے راہ روی ہی منکشف کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

”فجر الاسلام“ کے مصنف فرماتے ہیں کہ۔ مجموعی طور پر آگ شیعوں کے لئے حرام ہے۔ ”خدا معلوم یہ نظریہ شیعوں کی کس کتاب سے ڈھونڈ نکالا۔ کاش فاضل قلم کار کو نقد و نظر ہی کا کچھ خوف ہوتا۔ اور وہ اپنے ادعا کے لئے کوئی ثبوت ضروری سمجھتے۔“

شیعوں کی کتابیں، ان کے مؤلفات علی الاعلان کہہ رہے ہیں کہ: ”جنت“ اللہ کے فرماں بردار بندے کا انعام ہے



خواہ وہ غلام حبشی ہی کیوں نہ ہو۔ اور دوزخ سرکش عنصر کا حصہ ہے چاہے اس میں قرشی سید ہی کیوں نہ شامل ہو۔  
 اس مضمون کی روایتیں ان کے آئمہ سے مروی ہیں اور اس حد تک کہ شمار مشکل! البتہ مسئلہ شفاعت ایک علیحدہ چیز ہے، جس کے تمام مسلمان قائل ہیں۔  
 مگر ہم پھر کہیں گے کہ اگر اسے بھی شیعوں کا عقیدہ تصور کر لیا جائے تب بھی یہ یہودیت کا ظہور کیسے ہوا؟  
 جناب ابو حنیفہ زکاح کے بعض مسائل میں مجوسیوں سے اتفاق کرتے ہیں۔ لیکن یہ کہنا کسے زیب دے گا کہ امام احناف نے اپنی فقہ کی بنیاد مجوسیت پر قائم فرمائی ہے اور مزید ثبوت کے لئے آپ کے عجم نژاد ہونے سے بھی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ غرض کہ یہ سب جذباتی طور پر لیتے ہیں جن سے بس! آپس میں انتشار و افراق پیدا کرنے کی حسرتیں پوری کی جاتی ہیں۔

شیعہ مذہب میں مسیحیت کے اثر کا طعنہ بھی کچھ کم تکلیف دہ نہیں۔ دیانت داری کا تقاضہ تو یہ تھا کہ احمدیہ کوئی حوالہ سپرد قلم کرتے۔ لیکن غالباً انھوں نے خطابیہ، غرابیہ، علیاویہ، مجسمہ، بزیعیہ اور غلات جیسے فرقوں کو بھی

شیعہ سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ قرامطہ کی طرح ان ملحد گروہوں کو فرقہ شیعہ سے کوئی واسطہ نہیں۔ امامیہ شیعہ اور ان کے دینی پیشوا ان تمام مکاتب سے بے تعلق ہیں کیوں کہ مذکورہ جماعتیں عیسائیوں کی طرح نہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر یہ عقیدہ رکھتی ہیں کہ امام خود ذات باری ہے۔ خواہ یہ ظہور کی شکل میں ہو یا اتحاد و حلول کی صورت میں وغیرہ وغیرہ، ان کے یہ غلط افکار متصوفین کے عقائد و مسلمات سے کافی مشابہت رکھتے ہیں۔ مشہور مشائخ طریقت جیسے حلّاج، گیلانی، رفاعی اور بدوی وغیرہم کے اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود کو اس منزل پر فائز سمجھتے تھے، جو ان کی دانست میں ربوبیت سے بلند تر اور مقام الوہیت سے زیادہ اونچی تھی۔ وحدت الوجود کے قائل بھی کچھ ایسی سے ملتے جلتے تصورات کے حامل ہیں۔

مگر امامیہ شیعہ جو کروڑوں کی تعداد میں عراق، ایران، ذیلی بر اعظم ہند و پاکستان اور افغانستان میں آباد ہیں، وہ بحیثیت شیعہ ان تمام خرافات سے بری نیز ان جملہ مخرقات کو کفر و ضلالت شمار کرتے ہیں۔

ان کا مذہب توحید خالص ہے۔ نہ وہ ذات اقدس



الہی میں مخلوق کی کسی مشابہت کے قابل ہیں اور نہ اس کے صفاتِ کاملہ میں کسی نقص و تغیر کے روادار بلکہ وجوب وجود قدم، ازلیت اور تنزیہ و تقدیس کے منافی ہر تصور کو باطل قرار دیتے ہیں۔

شیعوں کا کلامی ذخیرہ ان بلند نظریات سے مملو ہے۔ اس سلسلے میں مختصر سے مختصر کتاب جیسے "تحرید" یا "بڑی سے بڑی تصنیف مثلاً اسفار" کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

نیز ان کے علاوہ اور ہزاروں کتب موجود ہیں جو زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں، اور ان کے اکثر ابواب تنازع، اتحاد، حلول اور تجسیم کی رد کرتے ہیں۔

بہر حال صاحبِ فخر الاسلام نے شیعوں پر انتہائی غلط الزامات عائد کر کے مذہب و ملت کی کوئی صحیح خدمت انجام نہیں دی۔ چونکہ ہم اس کتاب کا تعاقب نہیں کرنا چاہتے۔ اس لئے مزید لغزشوں کو نظر انداز کرتے ہیں، اور یہ چند باتیں بھی محض نمونے کے طور پر پیش کی گئیں تاکہ دنیا کو یہ تو معلوم ہو جائے کہ جب سوادِ اعظم کے علماء اور اہل قلم کا یہ حال ہے تو بے سواد عوام کی کیا کیفیت ہوگی۔

مصیبت یہ کہ شیعوں کے متعلق لکھنے والے عام طور پر

ابن خلدون بربری اور احمد بن عبد ربہ اندلسی جیسے دو افتادہ علاقوں کے خامہ فرسائوں کو ماخذ قرار دیتے ہیں یا پھر عصرِ حاضر کے قلم کار روشن خیالی کے زعم میں واپوزن اور ڈوزی وغیرہ کو حجت سمجھتے ہیں، مگر کوئی بندہ خدا شیعوں کے علمی ذخیرے کی جانب توجہ دینے کی زحمت نہیں گوارا کرتا۔ نتیجہ یہ کہ جب کوئی شیعہ ان افاضل کی تصانیف کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے اپنے بارے میں اسی قسم کی کچھ ٹھک بندیاں دکھائی دیتی ہیں جن کا تذکرہ راغب اصفہانی نے کسی موقع پر اپنی کتاب "المحاضرات" میں کیا ہے۔ موصوف ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ جعفر ابن سلیمان کے دربار میں ایک مسلمان کسی دوسرے کے کفر کا گواہ ہوا۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ مدعی کے متعلق کیا جانتے ہو تو اس نے بیان دیا کہ :

"یہ شخص معتزلی ہے، ناصبی ہے، حروری ہے۔

جبری ہے، رافضی ہے، علی ابن خطاب، عمر

ابن ابی قحافہ، عثمان ابن ابی طالب اور ابوبکر ابن

عقمان کو برا بھلا کہتا ہے۔ نیز کوفہ کو البوسفیان پر

دھانے والے اور قطائف کے دن (یوم طف =



روز عاشور) حُنین ابن معاویہ سے جنگ کرنیوالے

تجّاج کو گالیاں دیتا ہے۔

یہ سن کر جعفر نے کہا :

”خدا سمجھے تجھ سے ! نہ جانے میں تیری کس چیز پر

رشک کروں۔ تاریخ ذاتی پر، مذہب شناسی پر،

یا جغرافیائی معلومات پر !“

رہ گیا عبداللہ ابن سبا جسے شیعوں کے ساتھ چپکایا

جاتا ہے یا شیعہ فرقہ کو اس سے چپاں کرنے کی کوشش

کی جاتی تھے، اس ضمن میں شیعوں کی کسی بھی کتاب کا مطالعہ

کر لیا جائے، تمام مؤلفات میں اس شخص سے بیزاری کا

اعلان ملے گا، بلکہ رجال شیعہ میں اس کے متعلق جو ملائم

سے ملائم جملہ نظر آئے گا وہ یہ کہ ”عبداللہ ابن سبا

العن من ان یدکر“

اس سلسلہ میں بعض حضرات کی یہ رائے ہے کہ عبداللہ

ابن سبا مجنون عامری اور ابوہلال جیسے کردارِ داستانِ سہراؤں

کے افسانوی ہیرو ہیں۔ اموی اور عباسی سلطنتوں کے وسطی

دور میں عیش و عشرت اور لہو و لعب کو اتنا فروغ حاصل

ہو گیا تھا کہ — داستانِ گوئی اور افسانہ سہرائی محل

نشینوں اور آرام طلبوں کا جزو زندگی بن گئی تھی، چنانچہ اس

قسم کی بھی کہانیاں ڈھل گئیں۔

ہمارا مقصد تجزیہ احوال نہیں لیکن عصرِ حاضر کے مُصنّفوں

کے پے درپے حملوں کو دیکھ کر یہ ضروری سمجھا کہ مختصر طور پر

شیعوں کے عقائد و مسلمات اور ان کے اہم اصول و فروع

اور اجماعی مسائل کا تعارف کروادیا جائے۔ خیال رہے کہ شیعہ

مذہب میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے، اور جہاں تک

اجماع، کتاب، سنت اور ضروریاتِ عقل کی مخالفت نہیں

ہوتی۔ ہر مجتہد اپنی رائے میں آزاد ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کر

استنباط کرنے والے کو گمراہ تصور کیا جائے گا، اور ایسے شخص

کی رائے قطعی طور پر ذاتی، انفرادی اور ناقابلِ عمل

سمجھی جائے گی۔

ان اوراق میں تمام مسائل کی تفصیل کا موقعہ نہیں !

چنانچہ یہاں صرف وہ کلیات پیش کئے جائیں گے جو شیعیت کا

محور اور جن میں اختلافات کی کوئی گنجائش نہیں۔

دلائل و براہین کی جانب بھی زیادہ توجہ نہیں دی

جائے گی۔ کیونکہ یہ بڑی کتابوں ہی کے لئے مناسب ہے۔

نیز ہماری غرض و غایت صرف یہ ہے کہ تمام مسلمان انفرادی



اور اجتماعی طور پر شیعوں کے حقیقی معتقدات سے آگاہ ہو جائیں اور وہ اپنے بھائیوں کی جانب غلط فہمی کی نسبت دے کر خود پر ظلم نہ کریں، اور نہ انھیں بھڑوت پریت، دیو، جن، وحشی اور آدم خور سمجھ کر اپنے معاشرے سے الگ سمجھیں۔ کیونکہ خدا کے فضل و کرم سے شیعیان حیدر کرار آداب اسلامی سے آراستہ، تعلیمات قرآنی سے پیراستہ، نعمت ایمان سے سرفراز اور مکارم اخلاق سے مالا مال کتاب و سنت پر ایمان اور اصول عقل پر یقین رکھتے ہیں۔

آخر میں ہماری دعا ہے کہ خداوند عالم جذبات سے کھیلنے والوں کو سوچنے سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور وحدت اسلامی کو استحکام حاصل ہو۔

محمد حسین آل کاشف الغطاء

مجمع اشرف

جمادی الاول ۱۳۵۵ھ

شیعیان

کی

ابتداء = اتر = ارتقاء





## نایخ اعزاز

تشیع کوئی نیا مذہب نہیں۔ جہاں سے اسلام شروع ہوتا ہے وہیں سے شیعیت کی بھی ابتدا ہوتی ہے۔ چمن آرائے شریعت یعنی سرکار خاتم الانبیاءؐ نے اسلام کے ساتھ ہی ساتھ اپنے ہی ہاتھوں یہ پودا لگایا، آبیاری کی اور خود حضورؐ ہی اس کی نگہداشت فرماتے رہے۔ پودا بڑھ کر ہمارا درخت ہوا، اور رسول مقبولؐ کی زندگی ہی میں پھولنے بھی لگا، مگر پھلنے نہ پایا تھا کہ چراغ نبوتؐ گل ہو گیا۔

اور اچھا ہی طور پر شیعوں کے تین عقائد سے آگاہ ہو جائیں اور وہ اپنے بھائیوں کی جانب غلط فہمی سے سب سے گھر خود پر ظلم نہ کریں اور انہیں بھڑکاتے اور بدنام نہ کریں اور ان کو خود غور سے جانچ لیں۔ ان لوگوں کیونکہ خدا کے فضل و کرم سے ان کے دل پر اللہ کی آیتیں لکھی ہیں، آراستہ اقیانوس قرآن سے ان کے دل پر لکھی ہیں، سرازیر اور نکاح اخلاق سے ان کے دل پر لکھی ہیں اور ان کو ان کی عقل پر ایمان رکھنے میں اور ان کو سوچنے کی توفیق عطا فرمائے، اور ان کو اللہ کی رحمت سے بہرہ مند کرے۔

نصیر عیسیٰ

—ج—

الفتا = ۱۰ = الملتا



## حدیث دیگران

اس دعوے میں ہم منقرض نہیں بلکہ سوادِ اعظم کے  
بڑے بڑے علماء بھی ہمارے ساتھ شریک ہیں چنانچہ علامہ  
سیوطی اپنی مشہور تفسیر "درمنشور" میں ضمن قول باری تعالیٰ  
هُم خَيْرُ الْبَرِيَّةِ سورة بئینہ۔ پ۔ آیت: ۷ (وہ یقیناً  
بہترین خلایق ہیں) تحریر فرماتے ہیں:

ابن عساکر جابر ابن عبد اللہ کی زبانی بیان کرتے ہیں  
ہم رسالت مآب کی خدمت میں حاضر تھے، کہ  
سامنے سے علیؑ نمودار ہوئے پیغمبرؐ نے علیؑ  
کو دیکھ کر فرمایا: "قسم ہے اُس پاک پروردگار کی  
جو میری جان کا مالک ہے کہ قیامت میں یہ وہ  
ان کے شیعہ ہی کا میاب رہیں گے"۔ لہ

لہ الخرج ابن عساکر عن جابر بن عبد الله قال كنا عند النبي  
صلى الله عليه وآله وسلم فاقبل علي فقال النبي صلى الله عليه وآله  
وسلم والذي نفسي بيده ان هذا وشيعته لهم الفائزون يوم القيامة.  
یہ حدیث صواعق محرقہ کے صفحہ ۹۳ اور ابن عساکر مالکی کی الفصول المهمہ کے  
صفحہ ۱۲۲ پر بھی مرقوم ہے:

ابن عدی ابن عباس سے ناقل ہیں کہ جب آیہ وافی ہدایہ  
"إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ" نازل  
ہوئی تو حضرت ختمی مرتبتؐ نے علی ابن طالب سے ارشاد  
فرمایا کہ:

"اس سے مراد تم اور تمہارے شیعہ ہیں، جو  
قیامت میں خوش و خرم ہوں گے"

ابن مردویہ نے خود حضرت علیؑ علیہ السلام کی زبانی اس حدیث  
کی روایت کی ہے حضرت کا بیان ہے کہ: سرورِ عالم نے  
مجھ سے فرمایا: "اے علیؑ! کیا تم نے خداوندِ عالم کا یہ ارشاد  
نہیں سنا:

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ  
أُولَٰئِكَ هُم خَيْرُ الْبَرِيَّةِ (اس سے  
تم اور تمہارے شیعہ ہی مراد ہیں۔ میرا اور تم  
لوگوں کا وعدہ حوضِ کوثر پر پورا ہوگا، اور اس  
وقت جب کہ تمام امتیں حساب پیش کرنے

لے جو لوگ ایمان لائے، اور جنہوں نے نیک عمل کئے وہ یقیناً بہترین  
خلایق ہیں" سورة بئینہ۔ پ۔ آیت: ۷



کے لئے حاضر ہوں گی تم لوگ تابندہ جہیں  
روشن قدم کہہ کر بلائے جاؤ گے  
یہ سیوطی کی ترقیم کردہ روایتیں تھیں۔

ابن حجر مکی نے بھی ان میں سے بعض احادیث کو دارقطنی  
کے حوالے سے صواعق محرقہ میں درج کیا ہے، اور جناب  
اُم سلمہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ "اے علی تمہیں اور  
تمہارے شیعوں کو جنت نصیب ہوگی"۔  
ابن اثیر نے بسلسلہ لفظ فتح لکھا ہے کہ رسول کریم  
نے حضرت علی سے فرمایا :

"بارگاہ ایزدی میں جب حاضری ہوگی تو تمہارے  
ساتھ تمہارے شیعہ بھی شاد کام آئیں گے  
اور دشمنوں کا یہ حشر ہوگا کہ غضب میں مبتلا  
اور ہاتھ پس گردن سے بندھے ہوئے ہوں گے  
اس کے بعد آں حضرت نے اپنے دونوں ہاتھوں

۱۰ یَا عَلِیُّ اَنْتَ وَاصْحَابُكَ فِي الْجَنَّةِ۔

کو گردن کے پیچھے لے جا کر بتایا کہ دیکھو! یوں  
بندھے ہوں گے"۔  
غالباً یہ حدیث ابن حجر نے صواعق میں بھی درج کی ہے اور  
دوسرے علماء نے بھی اسے مختلف طریقوں سے نقل کیا ہے، جو  
اس کی شہرت کا ثبوت ہے۔ زمخشری کی "زیع الابرار" میں  
سرکارِ دو عالم کا یہ ارشاد نظر آتا ہے :  
"اے علی قیامت کے دن دامنِ رحمتِ باری  
میرے ہاتھ میں ہوگا، اور میرا دامن تمہارے  
ہاتھ میں، تمہارا دامن تمہاری اولاد تمہارے  
اور تمہاری اولاد کے شیعہ ان کے دامن سے  
متمسک ہوں گے۔ اس کے بعد دیکھنا ہمارے  
لئے کیا حکم ہوتا ہے۔"

۱۱ وَفِي حَدِيثِ عَلِيٍّ قَالَ لَهُ النَّبِيُّ سَتَقْدُمُ عَلَيَّ اللَّهُ اَنْتَ وَ  
شِيعَتُكَ رَاضِينَ مُرَضَّيْنِ وَيَقْدُمُ عَلَيْهِ عَدُوُّكَ غَضَابًا  
"مَقْمُوحِينَ" ثُمَّ جَمَعَ يَدَهُ اِلَى عُنُقِهِ يَرِيهِمْ كَيْفَ  
"الْاِقْمَاحِ"۔

۱۲ صَوَاعِقُ مُحْرِقَةٌ ، صَفْحہ ۱۵۹

۱۳ قَالَ يَا عَلِیُّ اِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ اخَذْتَ بِحِجْزَةِ اللَّهِ وَاخَذَتْ  
اَنْتَ بِحِجْزَتِي وَاخَذَ وَلَدُكَ بِحِجْزَتِكَ وَاخَذَتْ شِيعَةُ وَلَدِكَ  
بِحِجْزَتِهِمْ فَتَرَى اَيْنَ يَوْمَ بِنَا ؟



مزید اطمینان کے لئے مسند احمد بن حنبل اور خصائص نسائی وغیرہ کا مطالعہ سودمند ہوگا۔ جن میں ایسی حدیثوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

## قابل غور

مذکورہ احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام بارہا شیعیان علیؑ کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی اس خصوصیت کی جانب بھی اشارے فرماتے ہیں کہ یہ قیامت کے دن محفوظ رہیں گے کامیاب ہوں گے اور خوش خوش نظر آئیں گے۔

اب قابل غور بات یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو ختم المرسلین کو پیکر صداقت اور آیہ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ کا مصداق سمجھتا ہے۔ کم از کم اس نے تو ان اقوال کو ضرور سرمایہ ایمان تصور کیا ہوگا۔ اور اگر کسی وجہ سے اس وقت رسولؐ کی پوری محفل علیؑ کا ساتھ دینے کے لئے نہ تیار ہوئی ہوگی تو کچھ اصحاب کرام تو یقیناً ان اوصاف سے متصف ہونے کے لئے علیؑ کا دم بھرنے لگے ہوں گے تاریخی واقعات کی چھان بین کی جائے تو اس مفروضے کی خاصی تائید ہوتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ عہد نبوی ہی میں بزرگ اصحاب کا ایک گروہ جناب امیرؑ کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ اس جماعت کا ہر فرد حضرت کو اپنا روحانی پیشوا، تعلیم رسولؐ کا حقیقی مبلغ نیز احکام و اسرار نبوت کا واقعی شارح و مفسر بھی تسلیم کرتا ہے، اور شیعہ کے نام سے شہرت پاتا ہے۔

ارباب لغت بھی اس حقیقت کے حامی ہیں۔ مشہور فرہنگ نہایہ۔ اور لسان العرب اٹھا کر دیکھتے شیعہ کے معنی ہی یہ ملیں گے کہ یہ اس فرقہ کا اسم خاص ہے، جو علیؑ او اولاد علیؑ کا چاہنے اور ان کی پیروی کرنے والا ہو۔

اب اگر ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کی جائے کہ شیعہ سے مراد ہر وہ شخص ہے جو علیؑ سے محبت کرے یا آپؐ کا دشمن نہ ہو تو پھر اس لفظ کا استعمال ہی بے موقع ہو جائے گا۔ کیونکہ صرف چاہنے یا عداوت نہ رکھنے سے ایک شخص دوسرے شخص کا شیعہ نہیں کہلایا جاسکتا، جب تک اس میں التزام کے ساتھ افتدائے اور اتباع کی خصوصیت نہ پائی جائے، اور یہ ایک ایسی کھلی ہوئی بات ہے جسے عربی ادب کا معمولی سا ذوق رکھنے والے بھی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔



غالباً ان حقائق کے پیش نظر ہر معقول انسان مذکورہ احادیث پر توجہ دینے کے بعد یہی نتیجہ نکالے گا کہ لفظ شیعہ سے مقصود عام لوگ نہیں بلکہ ایک خاص گروہ ہے۔ جو حیدر کرار سے خصوصی تعلق رکھتا ہے۔

## معاون اشارے

اور اس تصریح کے بعد شاید ہی کوئی منصف مزاج یہ نتیجہ نکالنے کی جرأت کرے کہ مندرجہ بالا احادیث اور اس مفہوم کی دوسری روایتوں میں ایک ایسی جماعت کے وجود کی نمایاں دلیلیں نہیں ہیں۔ جو مولائے متقیان سے خصوصی ارتباط کے سبب اس وقت کے تمام مسلمانوں سے جو سب کے سب آپ سے اظہارِ محبت کیا کرتے تھے، ممتاز نہ ہوگی۔

میں ذاتی طور پر اس اعتراف کے موقف میں نہیں ہوں، کہ وہ صحابہ جو یہ راہ نہیں اختیار کر سکے انھوں نے شعوری انداز میں ارشادِ رسولؐ کی خلاف ورزی کی ممکن ہے ان میں سے بہت سوں نے یہ فرامین نہ سنے ہوں یا جن

لوگوں نے شرفِ سماعت حاصل کیا وہ منشاء رسالت ہی نہ سمجھ سکے ہوں!

علاوہ ازیں سرورِ عالمؐ کے وہ ارشادات جن کے ذریعہ حضورؐ نے امیر المومنینؑ، اہل بیتؑ اظہار اور ان کے شیعوں کے مدارج و مراتب کا اعلان فرمایا ہے اگر ان کے سمجھنے میں ذرا وسعتِ نظر سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان روایات میں صرف عمومی فضائل ہی نہیں بلکہ دلبتانِ تشیع کے سربراہ کی شناخت، حیثیتِ صلاحیت اور اس مکتب کے قیام و حقانیت کی جانب بھی واضح اشارے کئے گئے ہیں۔ مثلاً علیؑ کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسیٰ سے تھی۔ اے علیؑ تمہارا دوست مومن ہے اور دشمن منافق ہے اُمت والو! میں تم میں دو گراں بہا چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، اللہ کی کتاب اور میری عترت، میرے اہل بیت۔ حدیث طائر پروردگار اپنے محبوب ترین

۱۔ علی منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ

۲۔ لا یحبک الا مؤمن ولا یبغضک الا منافق۔

۳۔ اِنی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ وعترتی اہل بیٹی۔

(استیعاب جلد ۲۔ صفحہ ۴۷۲)



بندے کو بھیج دے۔ یہ کل یہ علم اس مرد کو دوں گا جو خود بھی اللہ اور رسول کا چاہنے والا ہوگا۔ اور اللہ اور رسول بھی اس کے چاہنے والے ہیں۔ علیؑ حق کے ساتھ ہیں اور حق علیؑ کے ساتھ ہے۔

یہ اقوال زیادہ تر صحیح بخاری اور صحیح مسلم سے ماخوذ ہیں اور ایسی ہی ہزاروں صحیح السند روایتیں موجود ہیں۔ اس مختصر سے رسالے میں اتنی گنجائش کہاں جو تفصیل کو جگہ دی جائے۔ شوق تحقیق رکھنے والے علامہ سید حامد حسین صاحب لکھنوی کی مشہور کتاب عبقات الانوار کا مطالعہ کر سکتے ہیں جو بلحاظ ضخامت و افادیت صحیح بخاری سے وہ چند بڑی اور ہمارے تحقیقی مساعی کا صرف ایک شاہ کار ہے۔

### رسول ﷺ کے بعد

لیکن جب نبوت کا چراغ بجھ گیا تو صحابہ کے ایک فریق نے یہ کوششیں شروع کر دیں کہ کسی طرح خلافت

لے لے اللہم ائمتی باحب خلقک الیک (سنن ترمذی صفحہ ۲۱۳)  
لے لے لا عظیم الراية غدا رجلا يحب الله ورسوله ويحبه الله و

رسولہ۔ (مسند احمد بن حنبل جلد ۵، صفحہ ۳۵۳)

۴ علیؑ مع الحق والحق مع علیؑ

علیؑ کو نہ ملنے پائے۔ اس مخالفت کا سبب خواہ آپ کی صغریٰ ہو یا خاندان قریش کا یہ جذبہ رشک کہ نبوت و امامت بنو ہاشم کے گھر میں نہ جمع ہونے پائے یا کچھ اور اسباب ہوں جن کے تذکرے کا یہ موقع نہیں!

لیکن باتفاق فریقین جب مسلمانوں سے بیعت لی جا رہی تھی، اُس وقت علیؑ نے ابو بکر کے اقتدار کو تسلیم نہیں کیا۔ اور بقول فاضل بخاری (صحیح باب غزوہ خیبر) آپ نے چھ ماہ تک بیعت نہیں کی جس کا فوری اثر یہ ہوا کہ نبیؐ کے بڑے بڑے صحابی جیسے زبیر، عمار، مقداد وغیرہ نے بھی بیعت سے انکار کر دیا۔

یہ واقعہ ہے کہ تقریباً ہر شخص اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ علیؑ کو نہ ریاست کی ہوس ہے، اور نہ سلطنت کی تمنا۔

ذوقار میں ابن عباس سے جو گفتگو ہوئی تھی وہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ فرزند ابوطالب کس جادہ پر گامزن تھا۔ امیر المومنین کے پیش نظر صرف ایک مقصد تھا اور وہ یہ کہ دین سلامت رہے، حق کا سکہ چلے اور باطل فنا ہو جائے۔



صاحب ذوالفقار ان ہی بلند احساسات کے زیر اثر  
محض احتجاج پر اکتفا کرتے ہیں اور سند خلافت کو اُلٹنے  
کی کوئی تدبیر نہیں اختیار فرماتے بلکہ مصالح رشد و ہدایت  
کے پیش نگاہ بقائے اسلام اور نشر احکام کے سلسلہ میں ہمیشہ  
حکومتِ وقت کو اپنے زریں مشوروں سے مستفید کرتے  
رہے۔ اور اگر علیؑ یہ مسلک اختیار نہ فرماتے تو نہ صرف  
اسلامی وحدت کا شیرازہ منتشر ہو جاتا بلکہ عوام پھر جاہلیت  
کی بھول بھلیتوں میں گم ہو جاتے۔

شیعہ بھی اپنے امیر کی روش پر چلتے رہے۔ تقاضا  
وقت ہی یہ تھا کہ تفریق سے کام نہ لیا جائے، اسی بناء پر  
خلفائے ثلاثہ کے دور میں اس فرقہ نے بحیثیت فرقہ اُبھرنے  
کی کوشش نہیں کی۔ البتہ دوستان علیؑ ہر حکمران کے طریق  
کار اور زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کا خاموش مطالعہ  
کرتے رہے یہاں تک کہ قوم نے خود ہی علیؑ کو منتخب کر لیا  
امیر المومنین تختِ امارت پر متمکن ہوئے لیکن امیر معاویہ  
بعناوت پر آمادہ ہو گئے، اور انھوں نے صفین میں اپنی  
فوجیں بھر دیں!

## نشر و اشاعت

صحابہ کی ایک جماعت تو پہلے ہی سے نصِ رسولؐ کے  
ساتھ تھی۔ یہ شورش دیکھ کر بقیہ اصحاب نے بھی آپؐ کی  
معیت اختیار کر لی۔ عمار یا سر خزیمہ ذوالشہادتین اور ابوالیوب  
الصّاری جیسے اُسی (۸۰) سربر آوردہ صحابی جو تقریباً  
سب کے سب بدری اور عقبی تھے، ابوترابؓ کی جماعت میں  
شامل ہو گئے اور ان میں سے اکشر نے اپنی جانیں امام  
پر نثار کر دیں۔

بہر حال لڑائیاں ہوتی رہیں اور ساتھ ہی معاویہ کی  
ریشہ دوانیاں بھی بڑھتی گئیں۔ نتیجتاً علیؑ نے جامِ شہادت  
نوش فرمایا۔ حاکم دمشق نے اطمینان کی سانس لی، مگر اب  
پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ معاویہ کے شاہی ایوانوں سے  
اسلام رخصت اور قیصر و کسریٰ کی روایتیں پروان چڑھنے لگیں  
ایک طرف علیؑ کا مقدس طریقِ حیات، زاہدانہ اطوار، اعلیٰ  
کردار اور اس کے مقابل معاویہ کے بگڑے ہوئے رنگ ڈھنگ  
عمر و عاص اور مصر کی تولیت!

یزید اور "حادثہ استخلاف!"

زیاد اور "واقعہ استلحاق!"



یہ ایسے غیر آیتنی امور تھے جن سے "معاویاتی ذہنیت" بری طرح آشکار ہو چکی تھی۔ پھر عیش و عشرت کے بڑھتے ہوئے طوفان نے تو گوشہ گوشہ نمایاں کر دیا۔ اللہ اللہ! کہاں اسلام کا بتایا ہوا سیدھا سادہ آئین زندگی۔ اور کہاں فرزند ابوسفیان کا باز لطیفی طمطراق۔

امیر معاویہ کے شاہانہ ارمان مسلمانوں کی گارھی کمانی سے پورے ہو رہے تھے۔ اموی راج محل کا سب رس یعنی وہ پُر تکلف و ستر خوان جو آج بھی ضرب المثل ہے شاہ جم جاہ کی لذت پرستی کا چنا ہوا ثبوت تھا۔

وزیر ابوسعید منصور ابن حسین آبی متوفی ۲۲ھ نے اپنی تالیف "نثر الدرر" میں ایک واقعہ لکھا ہے، موصوف تحریر فرماتے ہیں:

"احنف ابن قیس کہا کرتے تھے کہ ایک دفعہ میں امیر معاویہ کے پاس گیا تو انھوں نے میرے آگے انواع و اقسام کی اتنی غذا میں رکھ دیں جن کا شمار شکل تھا۔ میں دیکھ دیکھ کر حیران تھا کہ کھاتے کھاتے انھوں نے خاصے کی ایک چیز میری طفس بڑھانی جسے میں پہچان نہ سکا

دریافت کیا یہ کیا ہے؟ جواب ملا یہ بھیجا بھری بطخ کی آنتیں ہیں۔ پہلے انھیں پتے کے تیل میں تل لیا گیا، اور پھر اوپر سے مختلف مصالحے چھڑک دیئے گئے۔ "احنف کا بیان ہے کہ میں یہ سن کر رونے لگا۔ معاویہ نے پوچھا۔ روتے کیوں ہو؟ میں نے جواب دیا، اس وقت مجھے علیؑ یاد آگئے۔ ایک دن کی بات ہے۔ خدمت اقدس میں حاضر تھا، افطار کا وقت آگیا۔ حضرتؑ نے ٹھہرنے کا حکم دیا۔ اتنے میں ایک سر بہر تھیلی لائی گئی۔ میں نے سوال کیا حضور اس میں کیا ہے؟ ارشاد ہوا، جو کے ستو! عرض کی، امیر المومنین! چوری کا اندیشہ تھا یا شدت اقتصاد کے باعث تھیلی پر مہر لگائی ہے؟ فرمایا۔ ان میں سے کوئی وجہ نہیں۔ اس احتیاط کا سبب صرف یہ خیال ہے کہ کہیں میرے فرزند حسن و حسین ان ستوؤں میں گھی یا روغن زیتون نہ ملا دیں؟ میں نے پھر استفسار کیا "مولا! کیا گھی یا روغن زیتون کا استعمال ناجائز ہے؟ ارشاد ہوا،



ناجائز تو نہیں لیکن آئمہ حق کے لئے ضروری ہے کہ وہ خستہ حال عوام کی صفوں سے وابستہ رہیں تاکہ عسرت و افلاس اس فلاکت زدہ طبقے کو بانغی نہ بنا دے۔ معاویہ نے کہا: احف اقم نے اس وقت ایسے شخص کی یاد تازہ کر دی جس کے فضائل کا انکار مشکل ہے!

زخمشری کی ربیع الابرار وغیرہ میں ایسے اور بھی واقعات موجود ہیں۔

ہاں! امیر معاویہ کے فسادِ نفس کو صرف انہی بے ضابطوں سے بھلا کہاں قرار مل سکتا تھا، بد اعمالیوں کے منتہی تک پہنچنے کی آرزو دل میں چٹکیاں لے رہی تھی، چنانچہ انھوں نے امام حسن علیہ السلام سے جتنے عہد و پیمان کئے تھے، سب کی خلاف ورزی کی، اور بالآخر رسول کے لختِ جگر کو زہر دلوادیا۔ اس روش اور ان حادثات کا ردِ عمل یہ ہوا کہ اسلامی حلقوں میں شام کی سیاست کو نفرت و حقارت کی نظروں سے دیکھا جانے لگا، اور کم از کم اربابِ دیانت کو یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ امیر معاویہ قطعی طور پر صرف ایک دُنیا دار آدمی ہیں!

بلکہ وہ خود اس حقیقت کے معترف تھے: فضل زخمشری کی "ربیع الابرار" میں تاجدارِ دمشق کا یہ قول بھی موجود ہے کہ:

"ابو بکر نے دُنیا سے بچنا چاہا، اور دُنیا ان سے بچتی رہی۔ عمر نے دُنیا کو آزمایا، اور دُنیا نے ان کی آزمائش کی۔ رہے عثمان تو انھوں نے دُنیا پر خوب قبضہ جمایا مگر دُنیا بھی ہاتھ دھو کر ان کے پیچھے پڑ گئی۔ اور میں تو آسے فرشِ راحت بنانے کے لئے قدم قدم پر جان بچھاتا رہا۔ پایاں کار میں دُنیا کا ہو گیا اور دُنیا میری ہو گئی۔"

مختصر یہ کہ ایک طرف تو لوگوں کے رجحانات بدل رہے تھے اور دوسری جانب پیغمبر کے موجود الوقت صحابی جمہور اسلام کو علیٰ اور اولاد علی کے ان فضائل سے واقف کر رہے تھے جو انھوں نے رسول کی زبانِ فیضِ ترجمان سے سُنے تھے۔ اُن خصوصیات کا انکشاف کر رہے تھے جو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھیں۔

وہ منظر کسے یاد نہ ہوگا، کہ حبیبِ خدا اپنے چہیتے



نواسوں کو پشتِ مبارک پر بٹھائے ہوتے ہیں — اور فرماتے جا رہے ہیں :

”کیا کہنا تمھاری سواری کا، بہترین سواری

ہے، اور کیا کہنا تمھارا، بہترین سوار ہو“

نیز قالبِ وحی میں ڈھلے ہوئے یہ الفاظ کہ :

”حَسَنٌ وَحُسَيْنٌ جَوَانَانِ جَنَّتِ كَيْ سَرَّارِہیں“

کیا رہ کر اپنی اپنی اشاعت کا تقاضا نہ کرتے ہوں گے؟

حقیقتیں پھیلنے کا حق رکھتی ہیں، — اور احساسِ حق

رکھنے والے انھیں پھیلانے کے آرزو مند تھے۔

اس صورتِ حال کا یہ اثر ہوا کہ عام کلمہ گو شیعہ کی

جانب مائل ہونے لگے، اور اس منہ رتے کے لئے ترقی کی

راہیں کھل گئیں۔

## سب سے بڑا سبب

لیکن درحقیقت شیعیت کے فروغ کا سب سے بڑا

سبب وہ خونچکاں واقعہ ہے جس نے اسلامی دنیا میں ایک

عظیم انقلاب برپا کر دیا۔ اس کا یہ دردناک سانحہ جسے

امیہ کر بلا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اپنی نوعیت کے

لحاظ سے تشیع کی نشر و اشاعت میں بہت موثر ثابت ہوا۔

شہادتِ حسینؑ کے اثرات نے عمومیت اختیار کر لی۔ زید ابن

ارقم، جابر ابن عبد اللہ انصاری، سہل ابن سعد ساعدی او

انس ابن مالک جیسے صحابہ بھی زندہ تھے، فرطِ درد سے

ترپ اٹھے، اور بتقاضائے فرض و محبت، فضائلِ اہل بیتؑ

کی تشریح میں انھوں نے اپنی سرگرمیاں اور تیز کردیں۔ اموی

بحفاؤں نے ان کا پیچھا کیا، اور یہ بقیۃ الصحابہ بھی سیف و ستم

کا شکار ہو گئے۔ لیکن ع

”آہِ منظم اثر رکھتی ہے!“

یہ واقعات ایسے نہیں تھے کہ قوم ان پر غور نہ کرتی،

غور کیا اور اچھی طرح، جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ لوگ

جوق در جوق علیؑ اور اولادِ علیؑ کا دم بھرنے لگے،

نیز شیعوں کی عددی قوت میں غیر معمولی اضافہ ہونے لگا

جس مُرعت سے بنو امیہ کا ظلم بڑھ رہا تھا، اسی زقار سے

عام مَلُوب میں اہل بیتؑ کی محبت جاگزیں ہوتی جا رہی

تھی، آلِ امیہ نے بہت ستایا، جی بھر کے ستم ڈھائے لیکن

ہر عمل کا ردِ عمل ہوتا ہے۔ اموی مظالم کا بھی ردِ عمل ہوا،

اور بڑی شدت سے!



شعبی اپنے لڑکے سے کہتے ہیں :

”بیٹا! دین نے جن قدروں کو بلند کیا، دُنیا  
ان کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ مگر دُنیا نے جن چیزوں کو  
بنایا سنوارا، انہیں دین نے مٹا کر رکھ دیا،  
علیٰ اور اولادِ علیٰ ہی کے حالات پر غور  
کرو۔ امتیہ زادوں نے کیا کچھ نہیں کیا؟ ان کی  
فضیلتوں پر پرفے ڈالے، حقیقتوں کو  
چھپانے کی کوشش کی اور اپنے اسلاف کے  
گن گانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا، مگر  
الٹی ہو گئیں سب تدبیریں یعنی آلِ امتیہ کی  
آبرو مٹی میں مل گئی، اور آلِ محمد کا نام روشن  
سے روشن تر ہوتا چلا گیا“

شعبی باوجودیکہ علیٰ کے دشمن کی حیثیت سے شہرت رکھتے  
تھے، مگر یہ کلمہ حق ان کی زبان سے نکلا، اور تاریخوں میں  
محفوظ ہو گیا۔

## مزید اسباب

زمخشری نے ربیع الا برار، میں شعبی کا یہ بیان بھی درج کیا ہے:  
عجیب کشمکش کا عالم تھا۔ علیٰ سے محبت کرتے تو،  
قتل کا اندیشہ تھا، اور عداوت باز دھتے تو ہلاکت  
کا یقین!“

الغرض مصائب و آلام کا تانتا بندھا رہا۔ یہاں تک کہ سفیانی  
تخت مروانی حاکمِ عبد الملک کے قبضے میں چلا گیا۔ معلوم  
ہے یہ عبد الملک کون تھا؟ اُف! وہ شفی جس کے حکم سے  
تجاج نے خانہ کعبہ کو ڈھا کر اس میں آگ لگائی۔ جو احرام میں  
رہنے والوں کو بے جھجکا تہ تیغ کیا۔ عبداللہ بن ربیع کو مجروح  
میں قتل کر کے اس مقدس زمین کی حرمت کو خاک میں ملایا۔  
اپنے چچا زاد بھائی سعید ابن اشراق سے عہد و پیمان کر کے  
اس کی جان لے لی۔

سچ کہنا کلمہ گویو! ایسے سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے  
والے کو مسلمان بھی کہا جاسکتا ہے؟ چہ جائیکہ خلیفۃ المسلمین؟  
الحاصل آلِ مروان کی پوری حکومت اسی ڈھچھر پر چلتی رہی او  
عمر ابن عبدالعزیز کے علاوہ سب کے یہی نقشہ رہے۔ اس کے



بعد بنو العباس کا دور شروع ہوتا ہے۔ ان کے دور نے تو ماضی کے عصرِ ستم کو بھی مات دے دی۔

اُس وقت کا ایک شاعر کہتا ہے

یا لیت جور بنی مروان دام لنا

ولیت عدل بنی العباس فی النار

”کاش! ہم ہمیشہ آل مروان کی جفائیں سہتے رہتے

اور کاش! ان عباسیوں کا عدل و انصاف جہنم

واصل ہو جاتا۔“

کس بیدردی سے سادات کا خون بہایا گیا، کن کن طریقوں سے

انہیں ملیا میٹ کرنے کی کوششیں کی گئیں؟ اس وقت کا

ادب دیکھنے سے وہ تصویریں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔

شعرا نے مختلف پہلوؤں سے ان کے مظالم کو بے نقاب

کیا ہے۔ عہدِ متوکل کے ایک سخنور نے کتنی پختی تصویر کھینچی

ہے۔ کہتا ہے

قل ابن بنت نبیہا مظلوما

هذا لعمرک قبرہ مہدوما

کوافی قتله فتبعوه رمیہا

تالله ان کانت امیہ قد انت

فلقد انتہ بنو ابیہ بمثلہ

اسفوا علی ان لا یكونوا اشار

خدا گواہ ہے، اگر آلِ امیہ نے رسول کے نواسے

کو ظلم سے شہید کر ڈالا تو یہ عباسی جو اپنے تئیں

عِلمِ رسول کی اولاد کہتے ہیں، کسی طرح بھی ستم آرائی

میں اموی خاندان سے پیچھے نہیں رہے۔ دیکھو نا!

ان جفاکاروں نے تو مظلوم کی قبرِ ستم

منہدم کر ڈالی۔“

”ہاں ہاں! بنی عباس پھپھکتے ہیں، دستِ تاسف

کھتے ہیں کہ انھوں نے بنو امیہ کے دوش بدوش

حُصین کا خون ناحق بہانے میں کیوں حصہ

نہ لیا، اور اب مظلوم کی لحد سمار کر کے تلافی

ماقات کی کوشش کی ہے۔“

بنو امیہ آل مروان اور سلاطین عباسیہ کی سیرت کے یہ چند

نمونے تھے۔ اب اگر اس کے مقابل آپ علیؑ اور اولادِ علیؑ

کی پاکیزہ زندگی پر ایک نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ شیعیت

کیوں پھیلی؟ نیز یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ تشیع

ایرانیوں کی جدت طرازی اور بابائیوں کی کرشمہ سازی ہے یا

اسلام اور مسیحیت کا بتایا ہوا سیدھا سادہ راستہ ہے۔



## فرزندان علی علیہ السلام

سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام کے بعد  
علوی خاندان کے سربراہ امام زین العابدین علیہ السلام  
ہوئے۔ دنیا جانتی ہے کہ واقعہ کربلا کے اثر سے آپ بالکل  
گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ زندگی کا بیشتر وقت یا تو عبادت  
الہی میں گزرتا، یا تربیت اخلاق اور تہذیب نفس کا  
درس دیتے رہتے تھے۔

حسن بصری، طاؤس یمانی، ابن سیرین اور عمرو ابن عبیدہ  
جیسے مشہور زاہد و عارف اسی مکتب کے فیض یافتہ ہیں۔  
اس سلسلہ میں یہ کتبہ بھی قابل ذکر ہے کہ سید تاجاد  
کی اخلاقی درس گاہ سے مسلمانوں کو بروقت اور زبردست  
مدد ملی، کیوں کہ اُنہائے زمانہ حق اور حقیقت کے رستوں  
سے کوسوں دور پڑ گئے تھے!

## عهد زریں\*

صادق آل محمدؑ کا زمانہ نسبتاً موافق تھا۔ کیونکہ  
اموی اور عباسی حکمران تھک چکے تھے۔ حکومتوں میں

اضمحلال پیدا ہو گیا تھا۔ علانیہ ظلم و ستم کے مواقع ذرا کم  
ہو گئے تھے۔ بنا بریں دینی ہونی صداقتیں، اور چھپی ہوئی  
حقیقتیں سورج کی طرح ابھریں اور روشنی کی طرح پھیل گئیں  
خوف و خطر کے باعث جو لوگ تقیہ میں تھے، وہ بھی  
کھل گئے، فضا موافق تھی اور راہیں ہموار۔ امام عالی مقام  
نے تبلیغ و تلقین میں رات اور دن ایک کر دیئے۔ ہاں!  
تبلیغ و تلقین کا وہ سلسلہ جس کا تعلق محمدؐ و آل محمدؑ کی تعلیمات  
سے تھا، قائم فرمایا۔ درس حق عام ہوا، اور لوگ کثرت سے  
مذہب جعفری قبول کرنے لگے۔ اس عہد کو تشیع کی نشرو  
اشاعت کا زریں دور کہا جاتا ہے۔ کیونکہ قبل ازیں عام  
مسلمان اس افراط سے اور کھلم کھلا شیعیت کی جانب  
رجوع نہیں ہوئے تھے۔

دورِ یائے فیض جاری تھا، تشنگان معرفت خود بھی  
سیراب ہوتے تھے اور دوسروں کی بھی پیاس بجھاتے تھے۔  
بقول ابوالحسن و شمار:

میں نے اپنی آنکھوں سے مسجد کوفہ میں چار  
ہزار علماء کا مجمع دیکھا ہے اور سب کو یہ  
کہتے سنا ہے کہ حدّ ثنی جعفر ابن محمدؑ



یعنی یہ روایت مجھ سے جعفر صادق علیہ السلام  
نے بیان فرمائی ہے۔

بہر کیف بنو امیہ اور بنو العباس کی بے پناہ جاہ طلبی طوفانی  
تشدد، حد سے گزری ہوئی دنیا پرستی پھر غیبتِ محمدی  
رنگ رلیاں اور اس کے برعکس فرزندانِ علیؑ کی علم دوستی  
عبادت گزاری، حق پسندی اور غلط سیاست سے آہواز  
یہ ایسے صریح اور قوی عوامل تھے جو تشیع کے دامن کو  
وسیع سے وسیع تر کرتے چلے گئے۔

دیکھتے! یہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ دنیا والے  
جی بھر کر دنیا پر جان چھڑکتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان  
کے دلوں میں علوم و معارف اور امورِ دین کی عظمت کا  
احساس ہوتا ہے، اور ہم جس زمانے کا تذکرہ کر رہے ہیں وہ  
تو عہدِ رسالت سے قریب بھی تھا۔ نیز مسلمانوں کے دل و  
دماغ ان تاثرات سے مملو تھے کہ اسلامی نظامِ زندگی  
بے شمار برکتوں کا حامل ہے۔ قرآنی تعلیم سے انھیں وہ فیض  
حاصل ہوئے جن کا تصور بھی قبل ازیں ان کیلئے محال  
تھا۔ قیصر و کسریٰ کو اسلام ہی نے فتح کیا۔ اسلام ہی کے  
نام پر وہ شرق و غربِ عالم کے مالک بنے۔ علاوہ اس کے

وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس مذہب میں کافی حد تک  
وسعتِ نظر موجود ہے۔ طریقے جائز ہوں تو یہ دنیوی مال و  
متاع حاصل کرنے سے بھی کسی کو نہیں روکتا۔ یہ دین کیا ہے  
سراپا رحمت ہے!

غرضیکہ یہ قلبی احساسات چھپے ہوئے ٹھوکے تھے  
جو عوام کو علومِ دین کی جانب متوجہ کرتے رہے۔

رغبتِ کامل نہ سہی لیکن قدرے شوق ضرور ابھرا ہوگا  
کچھ چاہتے ہونگے کہ ہم اپنی حیاتِ اجتماعی کو احکامِ شریعت کی  
روشنی میں سنوار لیں۔ بعضوں کی یہ تمنا ہوگی کہ ہمارا معاشرہ  
اسلامی رنگ میں رنگ جائے اور کسی کو یہ ارمان ہوگا کہ کم از کم  
ہماری گھریلو زندگی ہی صحیح قوانین کے مطابق ہو جائے مگر  
یہ معارف حاصل کہاں سے کرتے؟ ان کجکلاہوں کے دربارے  
جو خلیفہ المسلمین کے تمنے لگائے ہوئے تھے اور بس؟ لیکن  
وہاں تو ان قدروں کا گزر بھی نہ تھا!

پھر کہہ رہے ہاں! جنھوں نے ڈھونڈھا انھوں نے  
پایا، اور ان کی مراد پوری ہوئی۔ آلِ محمد قرآن کا مخزن اور  
دانش و آگہی کا معدن تھے۔ ان ہی خوبیوں کے باعث عوامی  
ذہن پر نہ صرف ان کی برتری کے نقوش ثبت ہو گئے۔ بلکہ یہ



عقیدہ بھی مسلمانوں کے دلنشیں ہوتا چلا گیا کہ رسول مقبولؐ کے سچے وارث یہی ہیں۔ اور امامت ان ہی کا حق ہے۔

## خلوص کامل

پھر یہ عقیدہ اس درجہ مستحکم ہوتا گیا کہ اس جماعت میں شریک ہونے والے دنیا کے ہر خطرے کو ہیچ سمجھنے لگے۔ اکثر شیعہ تو عملی طور پر اتنے بڑی جاں باز اور احساسِ فرویت سے سرشار نظر آتے ہیں کہ جس کی کوئی حد نہیں مثلاً حجر ابن عدی کندی، عمرو ابن حمق خزاعی، رشید ہجری، میثم تمار اور عبداللہ ابن عقیف ازدی وغیرہم یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے مختلف مواقع پر باطل پرستوں سے باقاعدہ ٹکڑی۔ اچھا خاصہ مقابلہ کیا۔ اگرچہ کہ مخالف عنصر مادی اعتبار سے کافی مضبوط تھا مگر ان کی اخلاقی قوت نے، وہ کر دکھایا جو بڑے سے بڑے لشکر سے بھی نہ ہو سکتا۔ یعنی ان کی قربانیوں سے ایک طرف تو قصرِ ستم میں زلزلہ آگیا، او دوسری جانب عوامی ذہن و فکر کے رخ بدل گئے!

اب کوئی بتائے کہ یہ سرفروش کیوں اس طرح موت سے

کھیلے رہے؟ آل محمد سے کسی دنیاوی فائدے کی امید تھی؟ یا جان و مال کا خوف لاحق تھا؟ تاریخ دونوں سوالوں کا جواب نفی میں دے گی۔ کیونکہ فرزندِ ان مرتضیٰ تو مادی وسائل کے اعتبار سے خود ہی بے چارگی کے عالم نہیں تھے لہذا کیا دیتے اور کیا لیتے؟ کچھ نہیں ایمان کی بات تو یہ کہ ان مجاہدوں کے نورانی دل، یقین محکم اور خلوص کامل کے پاکیزہ جذبوں سے معمور تھے، اور یہی جذبے وقت پر بھرے دریا کی طرح اُمنڈنے لگتے تھے۔ علاوہ ازیں پہلی صدی اور دوسری صدی ہجری کے ادباء پر ایک نگاہ ڈال کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اُمید و بیم کے باوجود شعرائے وقت شاہانِ عصر اور ان کی بے راہ روی سے بے زاری کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں، اور اہل بیتِ مصطفویٰ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

حالانکہ شاعر اپنے بنتے بگڑتے کو زیادہ دیکھتا ہے مگر بایں ہمہ اس کے افکار خلفائے زمانہ کے خلاف اور ائمہ حق کے موافق ظاہر ہوتے ہیں۔ فرزدق، کمیت، سید حمیری، دَعْبَل، دیکت الجن اور ابو تمام ہجری سے لے کر ابو نضر اس حمدانی تک غور کرتے چلے آئے، سب کے سب عنترِ طاہرہ



کی مدح و ثنا میں ڈوبے ہوئے ملیں گے۔ ابو فراس کے مقبول  
عام قصیدے کا یہ شعر ہے

الدین محتومٌ والحق مهتضمٌ  
وفی آل رسول الله مقتسم

زبان حال سے واضح کر رہا ہے کہ اس عہد کے ادیبوں پر  
کیا اثر تھا۔

دعبل کہتے ہیں کہ۔ ”چالیس برس سے میں اپنی موت  
کا سامان (تختہ دار) لئے پھر رہا ہوں، مگر ابھی تک کسی نے  
قابل بننا منظور نہیں کیا۔“

دعبل نے رشید، امین، مامون اور معتصم کی خوب  
خوب ہجو کی، اور اس کے برعکس امام جعفر صادق، امام موسیٰ  
کاظم اور امام رضا علیہم السلام کی شان میں بڑے بڑے  
قصیدے نظم کئے جو کافی مشہور ہیں۔

آخر یہ تمام کے تمام بے سبب اپنی جان جو کھوں میں  
ڈال رہے تھے، بے مقصد اپنے عیش و آرام کو مٹی میں ملا رہے  
تھے، کوئی توجہ ہوگی؟

لے دین ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، بق نشانہ تم بن گیا۔ اور آل رسول کا حصہ آپس میں بانٹ لیا گیا۔

جب ہم اسباب و علل کا جائزہ لیتے ہیں تو آثار اس  
کے سوا اور کچھ نہیں بتاتے کہ یہ آل رسول کی صداقت تھی جو  
سوچنے سمجھنے والے دماغوں کو سرِ بفلک زریں ایوانوں سے  
متنفر اور آریہ مودت کی جانب مائل کرتی جا رہی تھی۔

یہ سلسلہ اور آگے بڑھ سکتا ہے مگر ایضاً مطلب  
کے لئے مزید خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں۔ بس! اس تمہید کا  
مقصد یہ تھا کہ تشبیح کی ابتداء اور ارتقار کے متعلق چند  
حقائق معلوم ہو جائیں اور غالباً اس ضمن میں کوئی بات  
مبہم نہیں رہی ہوگی۔ ایک سچی روداد تھی جسے نہایت اختصار  
کے ساتھ ہم نے پیش کر دیا، اور پھر اعادہ کئے دیتے ہیں کہ  
شیعیت کا آغاز خود نبی کریم کے ہاتھوں ہوا، اور اس کی  
نشر و اشاعت حالات و واقعات کا ایک زنجیر ہے جس  
کی ہر کڑی دوسری کڑی سے مربوط اور اسباب و علل کا ایک  
سلسلہ ہے جس کا ہر حلقہ دوسرے حلقہ سے متصل ہے۔





## منظری اور عملی مسائل!

قبل اس کے کہ ہم اصول و فروع کو جداجدا مباحث میں بیان کریں، مجموعی طور پر تمام مسائل کو عمومی اعتقاد کے مطابق پانچ کلیات پر منقسم کرتے ہیں:

- (۱) خالق کی معرفت۔
- (۲) اس کے مبلغ کی شناخت۔
- (۳) مسائل عبادت اور طریق عمل کی پہچان۔
- (۴) نیکیوں کا حصول اور بُرائیوں سے اجتناب۔
- (۵) معاد اور سزا و جزا کا اعتقاد۔

نہ پوچھیں نہ پوچھیں



اس لحاظ سے دین کے دو شعبے ہوئے "نظری" اور "عملی" عام اعتبار سے اسلام و ایمان "مرادف" ہیں۔

توحید، نبوت اور معاد اسلام کے تین بنیادی رکن ہیں اگر کوئی شخص ان ارکان میں سے کسی رکن کا منکر ہو، تو نہ وہ مسلم ہے نہ مومن، اور اگر ان ارکان پر ایمان لے آئے تو اس کا شمار مسلمانوں میں ہوگا۔ اور اسے مسلمانوں کے جملہ حقوق حاصل ہوں گے۔ لیکن حسب تصریح الایمان اعتقاد بالجنان و اقرار باللسان و عمل بالارکان لفظ ایمان سے ایک خاص مفہوم پیدا ہو جاتا ہے اور اسی کے ساتھ مزید ایک رکن کا اضافہ یعنی ان فرائض کی تعمیل جن پر اسلامی نظام کا دار و مدار ہے ان فرائض کی پانچ قسمیں ہیں:

☆ نماز ☆ روزہ ☆ زکوٰۃ ☆ حج ☆ جہاد  
"اسلام و ایمان" کے سلسلہ میں ہم نے عام و خاص کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام و ایمان کی دو قسمیں ہیں:  
اسلام و ایمان عام اور اسلام و ایمان خاص۔ یہ تقسیم پروردگار عالم کی اس ہدایت پر مبنی ہے:

لے قلبی اعتقاد، زبانی اقرار اور ارکان پر عمل کرنے کا نام ہے ایمان :

نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد

قَالَتِ الْأَعْرَابُ أَمَّا قُلُ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ  
(اعراب کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔ میرے رسول! انہیں سمجھا دو کہ تم جسے ایمان کہہ رہے ہو وہ ایمان نہیں، اسلام ہے ایمان کا تو تمہارے دلوں میں گزر بھی نہیں ہوا)

سورۃ الحجرات - آیت: ۱۴

مزید توضیح کے لئے دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ  
مُحَرَّرِينَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ

(حقیقتاً ایمان دار تو وہ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور اس کے بعد کبھی انھوں نے اس میں کوئی شک نہیں کیا نیز اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد کرتے رہے وہی سچے مومن ہیں)۔

سورۃ الحجرات - آیت: ۱۵

اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ دراصل قول، یقین اور عمل کے مجموعے کا نام ہے ایمان! بہر حال یہ تو تھا تمام مسلمانوں کے اساسی نظریات کا خلاصہ، مگر! شیعہ ان ارکان کے

نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، جہاد



ساتھ ایک اور رکن کو جزو ایمان قرار دیتے ہیں، یہ بنیادی مسئلہ عقیدہ امامت ہے۔

## منصب الہی

شیعی نقطہ نظر کے مطابق امامت نبوت کی طرح منصب الہی ہے جس طرح خداوند عالم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے نبوت و رسالت کے جلیل القدر عہدہ کے لئے منتخب کرتا ہے اسی طرح امامت کے معاملے میں بھی کسی کو کوئی اختیار نہیں، خود رب العزت نبی کو حکم دیتا ہے کہ وہ شخص منتخب کی امامت کا اعلان کرے۔ پیغمبر حسب الحکم فرائض شریعت کی تکمیل کے لئے نص کے ذریعے اس چنی ہوئی ہستی کو خلق کا پیشوا بنادیتا ہے نبی اور امام میں فرق صرف یہ ہے کہ نبی پر وحی نازل ہوتی ہے اور امام خصوصاً توفیق کے ساتھ رسول سے احکام حاصل کرتا ہے۔ پس رسول خدا کا پیام رساں ہے اور امام رسول کا پیام بر !

امامت بارہ ذوات مقدسہ میں منحصر ہے  
انحصار ہر امام نے ہونے والے امام کو نص کے ذریعے متبرک کیا۔

انبیاء کی طرح آئمہ بھی معصوم ہوتے ہیں  
عصمت تاکہ امکانِ خطا باقی نہ رہے۔ فرمان خداوندی قال اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا اِیْنَالُ عَهْدِیْ الظَّالِمِیْنَ لہ عصمت امام کی روشن دلیل ہے۔

علاوہ ازیں امام تمام علوم و صفات کے لحاظ سے سارے زمانے پر فوقیت رکھتا ہے۔ کیونکہ مقصد امامت ہی یہ ہے کہ انسانی دنیا کو منزل کمال تک پہنچایا جائے اور نفوس بشری کو علم و عمل صالح سے سنوارا جائے۔

نبوت کے سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے : هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمَمِیْنَ رَسُوْلًا مِنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِہٖ

لہ اس نے کہا میں تم کو خلق کا امام بنانے والا ہوں۔ (ابراہیم نے) عرض کی اور میری اولاد میں سے، ارشاد ہوا۔ میرے اس عہد پر ظالموں میں سے کوئی نہیں مارتا ہو سکتا؟ (بقدرہ - آیت: ۱۲۷)



وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ  
اس کا انطباق امام پر بھی ہوتا ہے۔ کیوں کہ کوئی ناقص  
کسی کو کامل نہیں بنا سکتا۔ جو خود کچھ نہ رکھتا ہو۔ وہ  
دوسروں کو کیا دے گا؟

آن خویش تن گم است کرا رہبری کند؟  
لہذا امام کمالات کے اعتبار سے نبی سے قدرے کم  
اور بشر سے بہت بلند ہوتا ہے۔

چنانچہ مذکورہ مفہوم کے مطابق اگر کوئی  
**مومن و مسلم** شخص امامت کا قابل ہو تو وہ شیعہ روایات  
کے لحاظ سے خاص معنوں میں مومن کہلاتا ہے اور اگر صرف ان  
ہی ارکان کا اقرار کرے جو عام مسلمانوں کا مرکز اعتقاد ہیں تو اسے  
عام معنوں میں مسلم و مومن کہیں گے، اور جیسا کہ قبیل  
ازیں بیان کیا جا چکا ہے کہ تمام احکام اسلام اس پر مرتب  
ہوں گے، اس کی جان، مال اور عزت و آبرو وغیرہ کا احترام  
فرض ہے۔

۱۵ وہی تو ہے جس نے امتیوں میں ان ہی کا ایک رسول بھیجا، جو انہیں اس  
کی آیات سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم  
دیتا ہے؟ (سورۃ جمعہ: آیت ۲)

حضرت امامت کا اقرار نہ کرنے سے کوئی فرد اسلام کے  
دائرہ سے خارج نہیں ہو سکتا۔ البتہ قیامت کے دن معلوم  
ہوگا، اور قرب و کرامت کی منزلوں میں یہ عقیدہ اپنا  
اثر دکھائے گا۔

دنیا میں تمام مسلمان یکساں اور ایک دوسرے کے  
کفو ہیں۔ ہاں آخرت میں ضرور درجوں کا تفاوت ہوگا۔ عمل  
اور نیت کے اعتبار سے مقامات ملیں گے خیر! آخری فیصلہ  
تو خدا کے ہاتھ ہے، ہم ان بحثوں میں کیوں پڑیں؟

**امامیت** | اچھا! تو ابھی یہ وضاحت کی جا رہی تھی  
کہ عام مسلمانوں میں شیعہوں کو جو  
امتیازی حیثیت حاصل ہے وہ اس وجہ سے کہ یہ آئینہ  
اثنا عشری امامت کے معتقد ہیں اور اسی بنا پر اس فرقہ کو  
امامیت کہتے ہیں۔

اس کا خیال رہے کہ تمام شیعہ امامیت نہیں ہیں۔  
کیونکہ لفظ شیعہ کا اطلاق زیدیت، اسماعیلیہ، واقفیت اور  
فطیہ وغیرہم پر بھی ہوتا ہے اور یہ تو وہ فرقے ہیں جو مسلمانوں  
میں شامل ہیں۔ لیکن اگر ہم دامن نظر کو ذرا اور پھیلا دیں تو  
بہت سے ایسے فرقے بھی ملیں گے جو دائرہ اسلام سے قطعاً



خارج ہیں مگر پھر بھی شیعہ کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں مثلاً خطابتیہ وغیرہ اور اس طرح تو بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ فرقوں کی فہرست تیار ہو سکتی ہے۔

لیکن موجودہ زمانے میں شیعہ کا نام امامیہ فرتے سے ہی مخفی ہو چکا ہے، جو سنتیوں کے بعد عالم اسلام کا سب سے بڑا مکتب فقہ ہے۔

**آئمہ اثناعشر** اسلامیات میں آئمہ اثناعشر کا عقیدہ کچھ نیا نہیں، مسلمانوں کی

جملہ معتبر و مستند کتابوں میں یہ ذکر خیر موجود ہے۔ امام مسلم و بخاری نے اپنے صحاح میں متعدد طریقوں سے حدیث اثناعشر کو بیان کیا ہے۔ ان میں سے چند حدیثیں درج کی جاتی ہیں۔ ملاحظہ ہوں :

(۱) جابر بن سمرو کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ اپنے باپ کے ساتھ پیغمبر اکرم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آنحضرت نے فرمایا کہ یہ نظام اس وقت تک ختم ہونے والا نہیں جب تک کہ بارہ خلیفہ نہ گذر جائیں۔ اس کے بعد حضور نے آہستہ سے کچھ فرمایا، جو میں سن نہیں سکا۔ اپنے باپ سے دریافت کیا کہ اس کے آگے سرکار رسالت نے کیا ارشاد فرمایا، جواب

ملا۔ نبی کریم کا فرمان ہے کہ۔ ”یہ سب قریش سے ہوں گے؟“ (۲) دوسری روایت ہے کہ ”جب تک بارہ مقتدر رہیں گے یہ معاشرہ یونہی برقرار رہے گا۔“

(۳) تیسری حدیث، جب تک بارہ خلفاء ہیں اسلام کی شان و شوکت باقی رہے گی۔“ لہ

اب خدا جانے یہ بارہ خلیفہ کون ہیں؟ سواد اعظم میں تو رسالت مآب کا یہ قول مشہور ہے کہ: ”میرے بعد خلافت تین برس رہے گی۔ پھر حرص و آز اور مکرو فریب کی آماجگاہ بن جائے گی۔“

یہاں ہمیں بحث و استدلال سے مطلب نہیں، صرف عقائد سے غرض ہے اگر کوئی آئمہ اثناعشر کی اہمیت کا تفصیلی ثبوت چاہتا ہے، تو ہماری ان ہزاروں کتابوں کا مطالعہ کر سکتا ہے جو علم کلام میں آپ اپنی نظیر ہیں :

۱۔ محمد بن اسماعیل بخاری نے اپنی ”صحیح“ کی چوتھی جلد باب الاستخلافات من کتاب الاحکام کے صفحہ ۱۶۲ پر، اور سلم بن حجاج القشیری نے اپنی ”صحیح“ کی دوسری جلد، کتاب الامارہ کے صفحہ ۱۱۹ پر ان حدیثوں کی تفصیل دی ہے : (نجفی)





شیعی نقطہ نظر سے مذہب دو شاخوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ علم اور عمل۔ یعنی کچھ مسئلوں کا تعلق عقل سے ہے، اور کچھ مسائل جسم سے متعلق ہیں۔ وہ مسئلے جن کا علاقہ علم یعنی عقل سے ہے انہیں اصول دین سے موسوم کیا جاتا ہے اور ان کی تعداد پانچ ہے: (۱) توحید (۲) نبوت (۳) امامت (۴) عدل (۵) معاد :

اب ہم ہر بحث پر علیحدہ روشنی ڈالتے ہیں :

نیلخانی، لید



## ★ توحید

امامیہ عقائد کے لحاظ سے ہر ہوش مند کا عقلی فرض ہے کہ وہ اپنے آفریدگار کو پہچانے۔ اس کی معرفت حاصل کرے اور اس کی وحدانیت والوہیت کا معتقد ہو۔ ربوبیت میں کسی کو اس کا شریک نہ قرار دے۔ اس کا یقین رکھے کہ خلق و رزق، موت و حیات اور ایجاد و اعدام اسی کی ذات سے متعلق ہے بلکہ اس عالم ہست و بود میں صرف اسی کی قدرت کاملہ کا عمل دخل ہے۔

اور اگر رزق و خلق یا موت و حیات کو کوئی شخص خدا کے علاوہ کسی اور سے منسوب کرے تو اسے کافر و مشرک اور دائرۃ اسلام سے خارج سمجھا جائے گا۔

اسی طرح اطاعت و عبادت میں اخلاص ضروری ہے یعنی اگر کوئی معبود مطلق کے ساتھ کسی اور سے کسی عبادت بجالائے۔ اس کے سوا کسی اور کی پرستش کرے، نیز اسے تقرب کا وسیلہ بنائے تو وہ بھی امامیہ مذہب کے حکم سے کافر متصور ہوگا۔

سوائے خدا کے وحدۃ لا شریک کے کسی کی عبادت

جائز نہیں۔ نیز ذات باری تعالیٰ، انبیائے کرام اور آئمہ اطہا کے علاوہ کسی اور کی اطاعت بھی روا نہیں۔

انبیاء اور آئمہ کی اطاعت بھی بالواسطہ خدا کی اطاعت ہے۔ کیونکہ یہ احکام الہی کے مبلغ ہیں لیکن خدا کی عبادت سمجھ کر ان کی اطاعت ناجائز ہے اور قطعاً شیطانی فریب!

اللہ ان ذوات مقدسہ سے طلب برکت اور انہیں اپنے اور اپنے معبود کے درمیان وسیلہ قرار دینا، نیز ان کے مزاروں پر اللہ کی عبادت بجالانا جائز ہے، کیونکہ یہ پرستش ان کی نہیں، خدا کی ہے۔ اور یہ ایک واضح سافرق ہے۔ حسب ارشاد باری تعالیٰ:

فِي بُيُوتِ أَذِنَ اللَّهُ أَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيهَا اسْمُهُ  
(وہ گھر جنہیں اللہ نے بلند ہونے کی اجازت دی اور ان میں اس کا ذکر ہوتا)

ان پاکیزہ بارگاہوں میں معبود برحق کی عبادت درست ہے۔ یہ ہے امامیہ فرقے کا عقیدہ توحید جس پر ہمارے تمام علماء متفق و متحد ہیں۔ بلکہ ہم نے جتنا بیان کیا ہے مسئلہ



وحدانیت "اس سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس کے کئی درجے قرار دیئے گئے ہیں مثلاً توحید ذات، توحید صفات، توحید افعال وغیرہ۔ چونکہ ہمیں اختصار کا لحاظ ہے۔ بنا بریں طوالت سے دامن بچا رہے ہیں۔

## ★ نبوت

نبوت کے بارے میں امامیہ شیعہ کا عقیدہ ہے کہ وہ انبیاء جو منصوص من اللہ ہیں، وہ سب کے سب خدا کے فرستادہ اور اس کے برگزیدہ بندے ہیں۔ یہ سب دُنیا کی ہدایت کے لئے مبعوث کئے گئے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاتم الانبیاء اور سید المرسلین ہیں آپ بالکل معصوم تھے۔ ہر کار سے نہ کوئی گناہ سرزد ہووانہ لغزش زندگی بھر حضور مرضی حق کے مطابق عمل کرتے رہے، اور مالک مطلق نے آپ کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر کرائی۔ وہاں سے آپ اپنے جہم مبارک کے ساتھ عرش و کرسی نیز ماورائے حجب و سراوق تک پہنچے، اور اپنے معبود سے اتنے قریب ہو گئے کہ "قاب قوسین" بلکہ اس سے بھی کم فاصلہ رہ گیا۔

اللہ کی وہ کتاب جو اس وقت مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہے، یہ وہی ہدایت نامہ ہے جسے پروردگارِ عالم نے معجزہ بنا کر نازل کیا۔ اور اس کے ذریعے احکام دین کی تعلیم دی۔ نہ اس میں کوئی کمی ہوئی نہ زیادتی مسلمانوں میں جو لوگ تحریف



میں ان مجاہدین میں سے ہیں جنہوں نے اپنی جانیں قربان کر دیں اور اللہ تعالیٰ ان کو جنت عرشہ اعلیٰ میں مبارک فرما کر اس کی وضاحت کرتی ہے

کے قائل ہیں، وہ خطا پر ہیں۔ کیونکہ اس اعتقاد سے نص کتاب  
اِنَّا نَحْنُ نَذَلُّنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ کی  
تردید ہوتی ہے۔

تمام علماء کا اس پر اجماع ہے اور اس کے خلاف  
کوئی روایت ملے بھی تو غیر معتبر ہوگی۔ کیونکہ جو حدیثیں طریق  
احاد سے دستیاب ہوتی ہیں وہ مفید علم و عمل نہیں  
تہرار پاسکتیں۔ بالفاظ دیگر ان کا کوئی اعتبار نہیں نیز  
شیعہ امامیہ کا یہ عقیدہ راسخ ہے کہ حضرت  
محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بعد جو  
شخص بھی نبوت یا نزول وحی کا دعویٰ کرے وہ کافر ہے  
اور واجب القتل۔

لفظ اس ذکر کو ہم نے نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں (سورہ حجر، آیت: ۹)

## ★ امامت

امامت! یہی وہ امتیازی مسئلہ ہے جس کی بناء پر شیعہ  
فرقہ عام فرقوں سے الگ تھلگ نظر آتا ہے۔ اور یہی وہ اساسی  
اور بنیادی فرق ہے جو اس مکتب خیال کو عام مکاتب سے  
علیحدہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جو اختلافات ہیں ان کی  
حیثیت اصولی نہیں بلکہ فروعی ہے۔ اس قسم کے ذیلی اور  
ضمنی اختلافات خود سواد اعظم کے آئینہ اجتہاد میں بھی  
پائے جاتے ہیں مثلاً حنفیوں کے بہت سے مسائل شافعیوں  
سے میل نہیں کھاتے۔ اور ان کے اُن سے۔ امامیہ فرقے  
کے نزدیک امامت وہ منصب الہی ہے جو نبوت کی  
طرح پروردگار عالم کی جانب سے ہدایت خلق کے لئے عطا  
ہوتا ہے۔ اور ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جناب باری عز اسمہ  
نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ وہ علی ابن ابی طالب  
کو اپنا جانشین کریں۔ تاکہ ختم نبوت کے بعد کار تبلیغ  
جاری رہے۔

رسول اکرم کو معلوم تھا کہ یہ عہدہ لوگوں کو کھٹکے گا



اکثر اسے بھائی کی چاہت، اور داماد نوازی پر محمول کریں گے۔

اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس زمانے سے لیکر آج تک مسلمان رسول کی واقعی بے لوثی اور حقیقی عصمت کے معاملے میں متحد الایمان نہیں نظر آتے، لیکن قدرت نے اس کی بھی پراہ نہیں کی۔ اور بالکل صاف صاف لفظوں میں حکم دیا:

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۚ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ (اے رسول! تمہیں جو حکم دیا گیا ہے اس کا فوراً اعلان کر دو۔ اور اگر مفوضہ کام کو انجام دہی میں ذرا بھی تساہل برتا تو یہ سمجھا جائے گا کہ تم نے کار رسالت انجام ہی نہیں دیا)۔

اس صورت میں سوائے تعمیل حکم کے اور کیا چارہ تھا؟ چنانچہ آپ نے حجۃ الوداع کے بعد غدیر خم میں لوگوں کو جمع کر کے ارشاد فرمایا:

♦ "الَسْتُ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ" ♦

کیا میں تمہام مومنین سے اولیٰ نہیں ہوں؟

۱۷ سورۃ مادہ: آیت ۶۷

یعنی میری ذات سب پر مقدم نہیں ہے؟ پورے مجمع نے ایک زبان ہو کر جواب دیا۔ بے شک رسول مقبول آپ ہم سب سے اولیٰ ہیں۔ ان گواہیوں کے بعد پیغمبر نے فرمایا:-

♦ مَنْ كُنْتُ مَوْلَاَهُ فَهَذَا عَلَيَّ مَوْلَاَهُ ♦

"جن لوگوں نے میری ولایت کو تسلیم کیا، یہ علی بھی ان کا ولی امر ہے۔" تا آخر خطبہ ۱۷

اس کے علاوہ بھی مختلف مواقع پر اس حقیقت کی توضیح و تصریح فرمائی ہے۔ گاہے اشاروں اشاروں میں اور کبھی کھلم کھلا حضو نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ حکم خدا کی تعمیل ہو گئی لیکن حتم المرسلین کی آنکھ بند ہوتے ہی بعض دیدہ دلیر مسلمان حقیقت پر پردہ ڈالنے کے درپے ہو گئے۔ نص صریح کی تاویل کی گئی اور اپنے اجتہاد سے احکام میں تغیر و تبدل کرنے لگے، نتیجہ جو ہوا ظاہر ہے۔

بہر حال! علیؑ اور ان کا گروہ جو بڑے بڑے جلیل القدر

۱۷ اس موضوع پر حجۃ الاسلام شیخ عبدالحسین امینی مرحوم کی انسائیکلو پیڈیا فی تصنیف "الغدیر" کی ۱۳ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔ قابل دید کتاب ہے۔



آخر میں علیؑ کی ولایت اور وصایت کے بارے میں حدیث  
پر رجوع فرمائیں

۱۳۶

صحابیوں پر شامل تھا، اس خود ساختہ روش سے علیؑ رہا اور  
اس جماعت کے ہر فرد نے بیعت سے انکار کر دیا۔  
چنانچہ امیر المومنینؑ مصالح دینی کے پیش نظر ایک  
زمانے تک تو خاموش رہے مگر جب معاویہ نے اسلامی  
حکومت و اقتدار کو اپنے زیر نگین کرنا چاہا، اور اس ضمن میں  
اس نے مختلف تحریبی کارروائیاں شروع کر دیں تو علیؑ  
ابن ابی طالب معارض ہوئے۔ کیونکہ معاویہ جیسے شخص کی نفی  
اور اس کے غلط طرز حکمرانی کو طرح دینا، اسلامی مفاد کے  
لئے زہر ہلاہل تھا۔ اور دین الہی کی حفاظت علیؑ کا سب  
بڑا فرض!

مختصر یہ کہ امامیہ حضرات اس امر کے معتقد ہیں  
کہ ہم علیؑ کے ساتھی ہیں، اور آپ ہی کے پیرو۔ علیؑ جس  
کے دوست ہم اس کے دوست اور علیؑ جس کے دشمن ہم  
اس کے دشمن!

یہ اعتقاد پیغمبر اکرمؐ کے اس ارشاد پر مبنی ہے:

• اللَّهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ وَعَادِ مَنْ عَادَاهُ •

”پروردگار! جو علیؑ کا دم بھرے تو اُسے دوست رکھ۔

۱۳۷

اور جو علیؑ سے بغض باز رہے تو بھی اس سے دشمنی کر۔  
امامیہ شیعوں کا عقیدہ ہے کہ خلاق عالم صفحہ گیتی کو  
کبھی کسی نبی یا وصی کے وجود سے خالی نہیں رکھتا۔ عام اس  
سے کہ یہ حجت ”ظاہر ہو یا غائب!“  
سرور کائناتؑ نے ”نص صریح کے ذریعہ علیؑ مرقضی کو  
اپنا وصی بنایا۔ علیؑ نے حسن مجتبیٰ کو جانشین کیا، اور امام حسنؑ  
نے اپنے بھائی سید الشہداء امام حسینؑ علیہ السلام کو یہ امانت  
سپردی۔ اس طرح یہ سلسلہ گیارہویں امام تک پہنچا گیا۔  
رہبر امام حسن عسکری علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے بارہویں  
امام حضرت مہدی منتظرؑ سلام اللہ علیہ کو صاحب الامر  
مقرر دیا۔

یہ اعتقاد شیعوں کی اُچھ نہیں بلکہ ایک سنت الہیہ  
ہے جو آدمؑ سے خاتم تک پہنچی۔

اس موضوع پر اعظم علماء کی بے شمار کتابیں موجود  
ہیں۔ ہم تہذیب اولیٰ اور صدر اول کے اُن چند ممتاز علماء  
کے نام درج کرتے ہیں، جنہوں نے وصیت کے عنوان پر  
قلم فرسائی کی ہے۔

۱۔ الوصیۃ ہشام ابن الحکم



- ۲۔ الوصیۃ "حسین ابن سعید"
  - ۳۔ الوصیۃ "حکم ابن مسکین"
  - ۴۔ الوصیۃ "علی ابن مغیرہ"
  - ۵۔ الوصیۃ "علی ابن الحسین ابن الفضل"
  - ۶۔ کتاب الوصیۃ "محمد ابن علی ابن الفضل"
  - ۷۔ کتاب الوصیۃ "ابراہیم ابن محمد ابن سعید"
  - ۸۔ الوصیۃ "احمد ابن محمد خالد البرقی صاحب المحاسن"
  - ۹۔ الوصیۃ "مورخ جلیل عبدالعزیز ابن یحییٰ الجلمودی"
- ان میں سے اکثر لکھنے والے قرن اول اور قرن دوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ تیسری صدی ہجری کے مولفات کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے مثلاً:

- ۱۔ الوصیۃ "یحییٰ ابن مستفاد"
- ۲۔ الوصیۃ "محمد ابن احمد الصابونی"
- ۳۔ الوصیۃ "علی ابن رباب"
- ۴۔ الوصیۃ "محمد ابن الحسن ابن فروخ"
- ۵۔ اثبات الوصیۃ والامامۃ "مورخ شہیر علی ابن حسین المسعودی صاحب مروج الذهب"
- ۶۔ الوصیۃ "شیخ الطائفہ محمد ابن الحسن الطوسی"

- ۷۔ الوصایا "محمد ابن علی الشلغانی"
  - ۸۔ الوصیۃ "موسیٰ ابن الحسن ابن طاہر"
- اور چوتھی صدی ہجری کے بعد جو کتابیں تالیف ہوئی ہیں ان کا تو شمار ہی مشکل ہے۔
- مسعودی اپنی مشہور کتاب "اثبات الوصیۃ" میں تحریر فرماتے ہیں:
- "ہر نبی کے بارہ وصی ہوئے!"
- مؤلف نے سب کے نام اور مختصر حالات بھی قلم بند کئے ہیں اور آخر میں آئمہ اثنا عشر کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ایران میں چھپ چکی ہے۔

## ☆ وجودِ حجت

البتہ وجودِ حجت کے سلسلے میں مسلم اور غیر مسلم دونوں حلقوں سے شیعوں پر اعتراضات کی بوچھاڑ کی جاتی ہے لہذا چند جملوں میں ہم اس حقیقت کی بھی توضیح کرتے چلیں: معتز ضنین کا خیال ہے کہ شیعہ ایک بے بنیاد مضحکہ خیز عقیدے کے قائل ہیں، لیکن جب ہم اعتراض کرنے



والوں کی فکر کا تجزیہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو نا فہمیدہ سوالوں پر مبنی ہے۔

☆ پہلا سوال یہ کہ طبعی طور پر ایک شخص ہزار برس سے زیادہ کیسے جی سکتا ہے؟

☆ دوسرا سوال یہ کہ آپ کے غائب ہونے میں کون سی مصلحت کار فرما ہے؟ اور ایک غائب امام کے وجود سے فائدہ؟۔ ہونا نہ ہونا دونوں برابر۔

پہلے اشکال کے متعلق ترقیم ہے کہ ذرا عمر نوج کا خیال ہے۔ قرآنی تصریحات کے مطابق جناب نوحؑ نے نو سو برس اپنی قوم میں گزارے، اور علماء نے آپ کی عمر کا جو اندازہ لگایا ہے، وہ کم سے کم ایک ہزار چھ سو سال ہے اور بہت سے دیدور افاضل تو تین ہزار برس کی خبر لائے ہیں۔!

حضرت نوحؑ کے علاوہ بھی جمہور کے علمائے حدیث دوسری ہستیوں کی درازی عمر کا اقبال کرتے ہیں محدث کبیر نووی اپنی کتاب تہذیب الاسماء میں ذکر فرما ہیں کہ جناب حضرتؑ کی عمر اور نبوت کے ضمن میں اگرچہ علماء مختلف رائے ہیں لیکن محققین کی اکثریت اس امر کی معترف ہے کہ جناب حضرتؑ موجود ہیں، اور صوفیائے کرام تو بالاتفاق آپ کی حیات پر

مصر ہیں۔ چنانچہ آپ کے دیدار، ملاقاتوں اور سوال و جواب وغیرہ کی ان گنت حکایات مشہور ہیں۔

شیخ ابو عمر وابن صلاح نے اپنے فتاویٰ میں تحریر کیا ہے کہ جناب حضرتؑ کے بارے میں جمہور علماء کا یہ فیصلہ ہے کہ آپ زندہ ہیں، لیکن بعض محدثین اس کا اقرار نہیں کرتے اور خیال پڑتا ہے کہ ایک دوسرے موقع پر موصوف یوں رقم طراز ہیں۔ نیز مختصری نے "ربیع الابرار" میں تحریر کیا ہے کہ:

"تمام مسلمان متفقاً چار انبیاء کی حیات اور وجود کے قائل ہیں۔ ان میں سے دو آسمان پر ہیں۔ یعنی عیسیٰ اور ادریسؑ اور دوزین پر، اور یہ ہیں خضرؑ و الیاسؑ۔"

جناب حضرت حضرت ابراہیم خلیلؑ کے زمانے میں پیدا ہوئے تھے، اور ایسی بہت سی شخصیتیں ہیں جنہوں عمر طبعی کی حدیں گزار کر زندگی کی سینکڑوں بہاریں دیکھیں۔

علامہ سید مرتضیٰ نے اپنی کتاب امالیٰ میں کچھ لوگوں کا ذکر کیا ہے اور صدوق علیہ الرحمۃ نے اکمال الدین میں اس سے بھی زیادہ طویل فہرست درج فرمائی ہے۔

عہد حاضر میں بھی ایسے اشخاص مل جاتے ہیں جنہوں نے



ایک سو تیس سال اور بعضوں نے اس سے بھی کچھ زیادہ زندگیاں پائی ہیں۔

اور دیکھتے! اگر آپ منطقی طور پر سوچیں گے تو معلوم ہوگا کہ جو شخص ایک دن کی زندگی بچانے کی صلاحیت پیدا کر سکتا ہے وہ حفاظتِ حیات کے سلسلے کو کئی ہزار سال تک بھی طول دے سکتا ہے۔ آپ زیادہ سے زیادہ اسے خرقِ عادت“ — قرار دیں گے۔ اچھا۔ یہی سہی۔ تو کیا انبیاء و اولیاء کے معاملات میں خرقِ عادت“ کوئی عجیب و غریب بات ہے؟ ”مجلۃ المقتطف“ کے پُرانے شمارے اٹھا کر دیکھتے! اس موضوع پر علمائے مغرب کے مقالے بھرے پڑے ہیں، جن میں انھوں نے سائنٹفک طریقوں سے ثابت کیا ہے کہ انسان دنیا میں حیاتِ جاودا حاصل کر سکتا ہے، اور بعض مغربی مفکر کہتے ہیں کہ:

”اگر ابنِ بلعم کی تلوار نہ ہوتی تو علیؑ ابنِ ابی طالب حیاتِ ابدی کے مالک تھے“

کیونکہ کمال و اعتدال کی جملہ صفتیں آپ کی ذات میں جمع تھیں۔ اس بحث میں بہت کچھ شامل کیا جاسکتا ہے، مگر زیادہ گنجائش نہیں۔

دوسرے اعتراض کے سلسلہ میں بگارش ہے کہ صاحب! کیا یہ قومِ خدا کی تمام حکمتوں اور مصلحتوں سے آگاہ ہونا چاہتی ہے؟ جملہ اسرارِ تکوینی و تشریعی سے واقفیت مطلوب ہے؟ اگر یہی منشاء ہے تو پھر بسم اللہ — مگر اتنا ضرور غور کر لینا چاہیے کہ حجابِ مصلحت میں اس کے علاوہ تو اور کوئی راز پوشیدہ نہیں۔

پارہ سنگ نہ تو کوئی نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، لیکن اس کے باوجود حجرِ اسود کو بوسہ دیا جاتا ہے! بتائیے کون سی حکمت مستور ہے؟

مغرب کی نماز تین رکعتوں میں ادا ہو جاتی ہے عشرہ کی چار رکعتیں پڑھنا پڑتی ہیں۔ صبح کو دو ہی رکعت میں فرض پورا ہو جاتا ہے، کہیے اس میں کیا مصلحت ہے؟ نیز یقین مانیے بہت سے ایسے امور بھی ہیں جن کا علم نہ کسی ملکِ مقرب کو ہے اور نہ ہی مرسل کو۔ مثلاً ”علم الساعة“ باری تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ عِنْدَآ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ لَہ

۱۴ اس گھڑی کا علم اللہ ہی کے پاس ہے۔ وہی مینہ برساتا ہے:



علاوہ ازیں اور باتیں بھی ہیں جو پردہ خفا میں رکھی گئی ہیں اور مصلحت نامعلوم! مثال کے طور پر اسہم اعظم، شب و قدر، ساعت استجابت دعا، وغیرہ وغیرہ۔

اس تمہید سے ہمارا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ باری تعالیٰ کے ان احکام و افعال کے سلسلہ میں جن کی حکمت غیر ظاہر ہو حیرت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں، بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ آیا وہ حکم یا فعل وجود رکھتا ہے یا نہیں؟

اب اگر پیغمبر اکرمؐ اور ان کے اوصیائے معصومینؑ کے اقوال صحیحہ سے یہ ثابت ہے تو ہمیں بس تسلیم کرنا پڑے گا، اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں! بحث حکمت لاحاصل اور لم کی تلاش بے سود۔

امکانی طور پر ہم نے کوشش کی ہے کہ اس مختصر رسالے میں دلائل و براہین کا انبار نہ لگنے پائے کیونکہ حیر حاصل بحث کے لئے بڑی بڑی کتابیں موجود ہیں اور متائم آل محمدؑ کے متعلق فریقین کے علمی خزانوں میں مستند احادیث کا کافی ذخیرہ محفوظ ہے۔

مصالحہ غیبت کے سلسلے میں اگرچہ کہ ہم اس حقیقت کے معترف ہیں کہ خدا اپنی حکمت خود بہتر جانتا ہے

پھر بھی استدسار کرنے والے بعض شیعہ حضرات کے جواب میں بہت سے معقول وجوہ پیش کئے جا چکے ہیں، جن کے اعادے کی یہاں وسعت نہیں۔

نیز اس ضمن میں فیصلہ کن بات یہ ہے کہ ہر زمانے میں امام کا ہونا ضروری ہے۔ "دنیا حجت سے خالی نہیں رہ سکتی، اس کا وجود بھی لطف ہے اور تصرف بھی لطف"۔ لہذا مصلحت کا سوال ساقط اور غیبت کا اقرار لازم!



## ★ عدل

خداوندِ عالم کسی پر ظلم نہیں کرتا، اور نہ اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا ہے جسے عقل سلیم بُرا سمجھے۔ اس اعتقاد کا نام ہے عدل۔

عدل، باری تعالیٰ کی صفتوں میں سے ایک صفت ہے جس کا وجود جامعیت صفت کمال و جمالِ الہیہ کے لئے ضروری اور شانِ توحید کے واسطے لازم سمجھا جاتا ہے لیکن اشاعرہ نے اس مسئلہ میں امامیہ اور معتزلہ کی مخالفت کی۔ (امامیہ اور معتزلہ کو عدلیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے) اور وجہ مخالفت یہ تھی کہ اشاعرہ حُنِ قبیح کے عقلی ہونے کے منکر ہو کر یہ کہنے لگے کہ حُن (اچھی) وہ شے ہے جسے شریعت حُن کہے اور قبیح (بری) وہ چیز ہے جسے شرع قبیح قرار دے یہاں تک کہ انھوں نے معرفتِ صالح اور پیغمبروں کی پہچان کے لئے معجزات کی جانچ پڑتال کو بھی سمع و شرع کے طریقوں پر محمول کیا۔ نیز حکمِ خرد کو بالکل ساقط کر دیا۔ نتیجہ وہ دور اور استحالے کے چکر میں پڑ گئے۔

لیکن عدلیہ یعنی امامیہ اور معتزلہ اس عقیدے

پر قائم رہے کہ ان نظریات میں فیصلہ عقل کے ہاتھ ہے۔ شریعت کو کوئی دخل نہیں، البتہ شرعی احکام سے تاکید اور ہدایت ہوتی ہے۔

عقل بعض افعال کو اچھا سمجھتی ہے اور بعض کو بُرا اور اسی عقل کا یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ "فعل قبیح" ذاتِ باری کے لئے محال ہے۔ کیونکہ وہ حکیم ہے اور فعلِ قبیح، منافیِ حکمت!

فرماں بردار کو مبتلائے عذاب کرنا ظلم ہے اور ظلم فعلِ قبیح ہے جو پروردگارِ عالم سے نہیں واقع ہو سکتا۔

نظرِ برائیں امامیہ فرقے نے مسئلہ عدل پر خصوصیت کے ساتھ توجہ دی۔ نیز خداوندِ عالم کی اس صفت کو اصولِ دین میں شامل کر لیا۔ ہاں! یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اشاعرہ خود بھی عدل کے منکر نہیں ہیں البتہ اس ضمن میں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ ایزد متعال خواہ کچھ کرے بہر حال عدلِ خوبی میں مندرق نہیں آ سکتا، وہ خیال کرتے ہیں کہ بھلا عقل کی کیا ہستی جو یہ فیصلہ کرے کہ خدا کے لئے یہ مناسب تھا اور یہ نامناسب۔

لیکن امامیہ اس حقیقت کو ثابت کرتے چلے آ رہے



کہ ہر چیز کی اچھائی بُرائی پر کھنے کا صحیح معیار عقل ہے، اسی کے ذریعے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ذات باری کو ہر خوبی سے متصف اور ہر بُدی سے منزہ ہونا چاہیے۔ اسی نظریہ حُسن و قبح عقلی کی اساس پر علم کلام کے اور بھی قواعد مرتب ہوئے مثلاً قاعدہ لطف و وجوب شکر منعم اور معجز میں وجوب نظر۔ نیز مسئلہ جبر و اختیار کی بنیاد بھی یہی ہے جبر و اختیار ان غیر معمولی مسائل میں سے ہے جن پر ایک زمانے تک بحث ہوتی رہی۔

اشاعرہ جبر کے قائل تھے۔ اور معتزلہ و امامیت کا خیال تھا کہ ہر انسان آزاد اور خود مختار ہے۔ اپنے ارادے سے سب کچھ کر سکتا ہے اور اپنی مشیت سے اپنے اعمال بجالاتا ہے۔ نفس و وجود کی طرح ملکہ اختیار بھی اللہ کی دین ہے خالق کائنات نے بندوں کو پیدا کیا، اور انھیں اختیارات دے دیئے۔ البتہ اختیار عام یا اختیار کُلّی خدا ہی کو حاصل ہے لیکن جزئیات میں ہم بالکل آزاد ہیں۔

پروردگار عالم نہ کسی انسان کو کسی کام کے واسطے مجبور کرتا ہے اور نہ اس کے ترک کے لئے۔ بلکہ فرزندِ آدم خود ہی مَن مانی کرتے ہیں۔

اسی بناء پر عقل اور عقل مندوں نے ان کی مدح و ذم کو جائز سمجھا ہے اور سزا و جزاء کو درست، اگر کسی نے کوئی نیک کام کیا ہے تو یقیناً اس کی تعریف کی جائے گی لیکن غلط کاروں کو قرار واقعی سزا سے کیونکر چھٹکارا مل سکتا ہے؟

پھر اگر ہم اس قاعدے کو نہ مانیں تو ثواب و عقاب کا نظریہ ہی باطل ہو جاتا ہے۔ بعثتِ انبیاء و نزولِ کتب بے سود اور وعدہ و وعید لا حاصل۔

ان صفحات میں اس سے زیادہ گنجائش نہیں۔ اس مسئلے پر ہم اپنی کتاب الدین والاسلام کے حصہ اول میں کافی روشنی ڈال چکے ہیں مختصر یہ کہ اس سلسلہ میں مذہبِ امامیت کا یہ عقیدہ ہے کہ:

اللہ عادل ہے، اور انسان آزاد و خود مختار!



## ★ معاد

عام مسلمانوں کی طرح شیعوں کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ پیدا کرنے والا سزا و جزا، اور حساب و کتاب کے لئے قیامت کے دن تمام مخلوق کو زندہ محصور کرے گا۔

معاد کے معنی یہ ہیں کہ :

ہر شخص بذاتِ خود بعینہ اپنے جسم و روح کے ساتھ میدانِ حشر میں اس طرح حاضر ہوگا کہ پہچاننے والا دیکھ کر کہہ دے، ہاں یہ فلاں آدمی ہے !

اس سلسلہ میں یہ جاننا ضروری نہیں کہ یہ واپسی کس انداز سے ہوگی — اعادۂ معدوم کے طور پر؟ ظہورِ موجد کے قبیل سے؟ — یا کوئی اور طریقہ ہوگا؟ نیز حشر و نشر کے ضمن میں کتابِ خدا اور احادیثِ صحیحہ میں جو کچھ ارشاد ہوا ہے۔ وہ سب جزوِ ایمان ہے، جیسے عقیدۂ دوزخ و بہشت۔ برزخ کی آسائش اور عذابِ میسران، صراط، اعراف اور وہ اعمال نامہ جو زندگی کا مرقع ہوگا۔

علاوہ ازیں شیعہ اس کے بھی معترف ہیں کہ ہر شخص اپنے اعمال کے لحاظ سے سزا و جزا کا مستحق ہوگا۔ نیکی کا بدلہ نیکی اور بدی کا بدی۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۖ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۖ

(جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی وہ اس کے سامنے آئیگی اور جس نے ایک ذرہ برابر بھی بُرائی کی ہوگی، اسے وہ دیکھنا پڑے گی)۔  
(سورۃ الزلزال - آیت: ۷-۸)

نظامِ عمل



نہایت تکرار و تکرار سے اس حقیقت پر آتا ہے کہ  
 اگر کوئی شخص اپنے دل سے اس بات کو الگ کر لے  
 اور اسے اپنے دل سے الگ کر لے تو اس کا دل  
 اس کے لئے ایک نیا عالم بن جائے گا۔  
 اس کے لئے اس کو اپنے دل سے اس بات کو  
 الگ کر لینا پڑے گا۔ اس کے لئے اس کو  
 اپنے دل سے اس بات کو الگ کر لینا  
 پڑے گا۔ اس کے لئے اس کو اپنے دل سے  
 اس بات کو الگ کر لینا پڑے گا۔

اس مسئلہ میں یہ جاننا ضروری نہیں کہ یہ واقعی کس  
 انداز سے ہوگی۔ اس بارے میں اس کے طور پر  
 خود کو جاننا ضروری ہے۔ اس کو اپنے  
 دل سے اس بات کو الگ کر لینا پڑے گا۔  
 اس کے لئے اس کو اپنے دل سے اس بات کو  
 الگ کر لینا پڑے گا۔ اس کے لئے اس کو  
 اپنے دل سے اس بات کو الگ کر لینا  
 پڑے گا۔ اس کے لئے اس کو اپنے دل سے  
 اس بات کو الگ کر لینا پڑے گا۔



پیش لفظ

یہ کتاب شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ شریعت الہی  
 کی رو سے تمام احکامات میں یہ رو کا رعب عالم کا  
 کوئی نہ کوئی مندرجہ ہے۔ قانون اس کے مجمل میں  
 ہر ایک کی دیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔  
 غرض کسی گفت کا کوئی نہ کوئی مندرجہ  
 نہیں ہے۔

نظام عمل





### ★ پیش لفظ

امامت، شیعوں کا یہ عقیدہ ہے کہ شریعتِ اسلامی  
کی رُو سے زندگی کے جملہ معاملات میں پروردگارِ عالم کا  
کوئی نہ کوئی فرمان موجود ہے۔ قانونِ الہی نے معمولی سی  
نخراش کی دیت کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔

نعرض کسی مکلف کا کوئی عمل بھی ایسا نہیں ملے گا، جو  
مندرجہ ذیل احکام میں سے کسی حکم کے دائرے میں نہ ہو۔

معمول لفظ



## واجب، حرام، مستحب، مکروہ، مباح

لین دین ہو یا قول و تہرار، شرع ضرور بتائے گی کہ یہ  
 درست ہے یا نا درست!

### ★ سرچشمہ:

پیغمبرؐ کی ذاتِ بابرکات احکامِ الہیہ کا سرچشمہ ہے،  
 باری تعالیٰ نے وحی والہام کے ذریعہ یہ احکام سرکارِ ختمی  
 مرتبت کو ودیعت فرمائے۔ آپ نے حسبِ تقاضائے حال  
 لوگوں کو واقف کرایا، اور خاص طور سے ان اصحاب کو  
 جو ہمہ وقت حاضر بارگاہِ رستے تھے۔ تاکہ بمصدقِ آیہ مبارکہ

لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَ

يَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا

وہ پوری دنیا میں تبلیغ کرتے رہیں۔

مگر بہت سے حکم ایسے بھی تھے جن کی تعلیم نہیں  
 دی جاسکتی۔ خواہ اس وجہ سے کہ ان کے لئے موقع نہ تھا، یا

۱۴ سورۃ بقرہ - آیت ۱۴۳۱ - تاکہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو۔ اور  
 رسولؐ تم پر گواہ ہو۔

اس لئے کہ پیغمبرؐ کے زمانے میں ان ضوابط کی ضرورت  
 نہیں پڑی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی مصلحت کی بناء پر عام  
 نہ کئے گئے ہوں۔

اسی لئے کچھ احکام مشہور ہو گئے اور کچھ مستور رہے  
 لیکن نبی کریمؐ نے ان پوشیدہ احکام کو اپنے اوصیاء کے سپرد  
 فرما دیا۔ بعد ازاں ہر وحی اپنے جانشین کو بتاتا رہا کہ حسبِ  
 اقتضائے زمانہ اور مناسبتِ وقت ان کی اشاعت ہوتی رہے۔

### ★ اختلاف

رسولؐ مقبول نے جس طرح اور جس قدر مناسب سمجھا  
 بیان فرمایا۔ اور صحابہؓ نے بھی اپنی اپنی فہم کے مطابق جو سمجھ  
 میں آیا وہ سمجھا۔ ابرِ رحمت تو کھل کر برسا، مگر فیض حاصل  
 کرنے والوں کا اپنا اپنا ظرف۔ پھر سب کی ذہنی توانائیاں  
 یکساں بھی تو نہیں ہوتیں۔

من و طوبی و سر و وقامت یار

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

ایسا بھی ہوا کہ ایک صحابی کسی معاملہ میں مثبت حکم پاتا ہے  
 اور دوسرا اسی سے ملتے جلتے واقعہ میں منفی حکم سنتے ہیں



نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فعل ایک اور احکام دو۔ یہ کتنا صریحی  
اختلاف ہوا؟ اچھا! اب اس اختلاف کا سبب کیا ہے؟  
بات یہ ہوگی کہ ان دونوں مواقع میں سے کسی ایک میں کوئی  
قرینہ ہوگا، کوئی خاص پہلو ہوگا۔ نقل کرنے والے یا تو اس  
قرینے اور تخصیص کی طرف متوجہ نہیں ہوئے یا توجہ تو کی مگر  
خصوصیت اور قرینہ کا ذکر نہیں کیا۔ لہذا حدیثوں میں  
ظاہری فرق تو نظر آسکتا ہے لیکن واقعی اختلاف کا شائبہ نہیں

## ★ اجتہاد

اسی قبیل کے مختلف اسباب پیدا ہوئے جس کی وجہ  
سے صحیح حکم شناسی میں دقتیں پیش آنے لگیں۔ بنا بریں اور  
تو اور خود وہ اصحاب جنہیں رسولؐ کی خدمت کا شرف حاصل  
تھا، اجتہاد کا سہارا لینے لگے۔ چنانچہ حدیثوں کے کسے اور پرکھنے  
کا خیال دامن گیر ہوا۔ قرآن کی چھان بین ہونے لگی۔ کیوں کہ  
بسا اوقات یہ بھی دیکھا گیا کہ حدیث کا ظاہری مطلب کچھ ہوتا ہے او  
شارع کا مقصد و منشا کچھ اور ہوتا ہے قبل ازیں اشارہ  
کیا جا چکا ہے کہ اس تفاوت کے اسباب میں نقل کی خامی  
یا نفاستوں کی کوتاہی کو بڑا دخل ہے۔

## ★ مجتہد:

رسالت مآب کے وہ اصحاب جو صاحب الزرائے اور  
اہل روایت تھے۔ انہوں نے بھی کبھی تو پیغمبرؐ کے قول کو بعینہ  
ان ہی الفاظ میں دہرا دیا جن لفظوں میں سنا تھا، او  
گا ہے نفس حدیث کی جگہ وہ حکم بیان کر دیا جو متعلقہ حد  
سے اخذ کیا تھا۔

پہلی صورت میں ان کی حیثیت راوی اور محدث کی  
ہوتی ہے اور دوسری شکل میں وہ مفتی اور صاحب رائے کی  
شان رکھتے ہیں۔ جن میں یہ ملکہ ہوا انہیں مجتہد کہا جاتا ہے۔

## ★ مقلد:

اور وہ عام مسلمان جو اس مرتبہ پر فائز نہ ہوں اور مجتہد  
کی رائے پر عمل پیرا ہوں، انہیں مقلد کا نام دیا جاتا ہے۔

الحاصل اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ  
اس حضرت کے زمانے ہی میں اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا تھا،  
اور خود آپ کے اصحاب اس پر عامل تھے البتہ اس عہد میں  
اجتہاد اتنا توانا نہیں تھا جتنا اب ہے، کیونکہ لوگ براہ راست

اس موضوع پر وضاحت پڑیں  
مقلد کس کو کہنا چاہیے



پوچھ سکتے تھے۔ قرآن وافر تھے۔ علم قطعی حاصل کرنے کے تمام ذرائع موجود تھے۔ لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا نبوت سے دوری ہوتی گئی۔ عربوں اور عجموں میں میل جول بڑھا۔ عربی زبان کے صحیح مطلب سمجھنے میں دقتیں ہونے لگیں۔ احادیث و روایات کی بہتات ہوئی جن میں بہت سی مشکوک اور موضوع روایتیں بھی تھیں۔ کثرت سے جھوٹے اقوال پیغمبر کی جانب منسوب ہونے لگے۔ اس منزل پر احکام شریعت کا پرکھنا آسان کام نہ تھا۔ نظر ہر این اجتہاد نے قوت حاصل کی۔ استنباطی طریقوں میں زور آیا۔ صحیح و سقیم میں امتیاز ہوا۔ اصول ترجیح سے کام لیا گیا۔ بہر کیف ضرورتیں بڑھتی گئیں مجتہد کاوش فرماتے رہے اور دامن استنباط پھیلنا گیا۔

امامیہ فرقہ کے ہاں اب تک یہ نعمت موجود ہے۔ دیکھئے! ہمارا آپ کا مشاہدہ بتاتا ہے کہ تمام انساخ دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ باسواد، بے سواد (خواند و ناخواند) نیز قدرتی طور پر بے سواد جماعت کو اپنی ضروریات کی تکمیل کیلئے باسواد طبقہ کی مدد حاصل کرنا پڑتی ہے اسی طرح شریعت کی دنیا میں بھی دو فریق ہیں۔ عالم مجتہد اور جاہل مفتد۔ قاعدے کے لحاظ سے دوسرے طبقہ کو مسائل سے واقفیت

حاصل کرنے کے لئے پہلے طبقہ کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ عام مسلمانوں کی طرح شیعہ بھی یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ احکام شرع کا دار و مدار کتاب و سنت اور اس کے بعد عقل و اجماع پر ہے۔ البتہ امامیہ فرقہ حسب ذیل راتوں میں دوسروں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

### ۱۔ قیاس :

شیعہ کبھی قیاس پر عمل نہیں کریں گے۔ کیونکہ تواتر کے ساتھ ان کے آئمہ نے ارشاد فرمایا ہے: "إِنَّ الشَّرِيعَةَ إِذَا قِيسَتْ مُحَقَّقُ الدِّينِ"۔ اگر شرعی معاملات میں قیاس آرائیاں ہونے لگیں تو دین کا نقشہ بگڑ جائے گا۔ عمل بالقیاس کی خرابیوں کو ہم واضح کرتے مگر موقعہ نہیں۔

### ۲۔ روایت غیر معتبر :

یعنی اگر حدیث رسول اہل بیت اطہار کی وساطت سے ملے گی تو لائق اعتبار ورنہ ناقابل تسلیم! غیر معتبر! البوہرہ، سمہ بن جندب، مروان بن حکم، عمران بن حطان حجازی اور عمرو بن عاص وغیرہم کے روایات کی ہمارے ہاں کوئی وقعت نہیں



اور شیعوں ہی پر کیا منحصر، خود علمائے اہل سنت نے بھی ان راویوں کی دہشتیاں اڑائی ہیں۔ خوب خوب پول کھولے ہیں۔

۳۔ عدم تقلید

ابھی ذکر ہو چکا ہے کہ شیعوں کے ہاں اجتہاد کا دروازہ آج تک کھلا ہوا ہے، اور ہمیشہ کھلا رہے گا۔ برخلاف اس کے سوادِ عظم میں ابواب استنباط مقفل ہیں۔ یہ عمل کب اور کس دلیل سے ہوا۔ اس سلسلہ میں غالباً خود ان کے علماء بھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں رکھتے۔

ان امور کے علاوہ باقی اختلافات فروعی ہیں۔

## ★ منصبِ اجتہاد

دلائل و براہین میں رچ کر جو شخص احکام شرعیہ کے اخذ و استنباط کی قوت حاصل کرے اسے منصبِ اجتہاد پر فائز سمجھنا چاہیے۔ مگر صحتِ تقلید کے لئے اس کے علاوہ بھی کچھ شرطیں ہیں، سب سے اہم شرط عدالت ہے۔ عدالت سے مراد وہ باطنی جوہر ہے جس کے ہونے سے انسان اپنی پوری زندگی میں معصیت سے بچنے اور تمام واجبات کی انجام دہی پر قدرت حاصل کر سکتا ہے، یا یوں کہا جائے کہ خوفِ خدا کی وہ کیفیت جو

ہر حال میں دل و دماغ پر طاری رہے۔ اس کے کئی درجے ہیں سب سے بڑا درجہ عصمت ہے، جسے امامت کی شرط قرار دیا گیا ہے۔

علاوہ ازیں ضروریات (وہ امور جن کا تعلق علمِ قطعی سے ہے) میں نہ تقلید ہے نہ اجتہاد! جیسے وجوبِ صوم و صلوٰۃ وغیرہ۔ اسی طرح اصولِ دین، بھی تقلید و اجتہاد کی حدوں سے باہر ہیں۔ کیونکہ ان کا تعلق ہر مکلف کے شخصی علم و تحقیق سے ہے اور جن حقائق کی واقفیت ہر شخص کی اپنی سمجھ بوجھ اور ذاتی دانش و آگہی پر منحصر ہو، انہیں دوسروں کی رائے پر نہیں چھوڑا جاسکتا۔ ان کے سوا باقی جتنے بھی فروعی مسائل ہیں، وہ سب اجتہاد و تقلید کے دائرے میں ہیں۔

نیز مکلفوں کے اعمال ہی احکامِ شریعت کا موضوع ہیں، لہذا ان کا جاننا ضروری ہے، اور جاننے کے بس دو ہی طریقے ہیں، تقلید یا اجتہاد۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ان طریقوں میں سے اگر کسی طریقہ سے معرفت حاصل نہ کی تو قیامت کے دن سزا بھگتنا پڑے گی۔ اعمال کا جائزہ لیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ :-



ا۔ کچھ عمل تو خدا اور بندے سے متعلق ہیں۔ یہ عبادات کہلاتے ہیں۔ ان کی صحت خدا سے نزدیک ہونے کی نیت پر موقوف ہے۔ (قربت الی اللہ)

عبادتیں یا تو جسمانی ہوتی ہیں جیسے نماز، روزہ، حج یا مالی جیسے خمس و زکوٰۃ و کفارات۔

ب۔ اور کچھ اعمال فرد اور سماج سے متعلق ہیں، ان کی بھی دو صورتیں ہیں۔ دو فریقوں سے وابستہ، مثلاً لین، دین، شادی بیاہ۔ ایک ہی فریق سے مختص جیسے طلاق اور عتق وغیرہ۔

ج۔ نیز بعض عمل بالکل شخصی اور ذاتی ہوتے ہیں، جیسے کھانا پینا، پہننا اور ٹھنا۔

فقہ:

ان تمام اعمال کے مجملہ احکام سے، فقہ چار ابواب میں بحث کرتی ہے:

☆ عبادات

☆ معاملات

☆ ایقتاعات

☆ احکام

اہم ترین عبادتیں چھ ہیں۔ دوسری، جسمانی یعنی نماز۔ روزہ دو خالص مالی، یہ ہیں خمس و زکوٰۃ اور دوسری، جنہیں حج و جہاد کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

ارشاد باری ہے:

جَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ

تم اپنی جان و مال دونوں سے جہاد کرو!

اور کفارات، چند خاص جرائم اور کوتاہیوں کی مخصوص سزائیں ہیں:



## ★ نماز

تمام مسلمانوں کی طرح شیعہ بھی نماز کو دین کا رکن سمجھتے ہیں۔ یہ عبادت بندے کو خدا سے نزدیک کرنے کا ایک وسیلہ ہے، جو کہیں یہ عمل چھوٹ جائے تو عبادت معبود کا رشتہ ہی ٹوٹ جاتے۔

اسی واسطے اہل بیت کی احادیث میں وارد ہوا ہے کہ ایک دو نمازوں کا چھوڑنا ہی کفر و اسلام کا درمیانی فرق ہے۔ شریعت کی رو سے نماز کو بڑی اہمیت حاصل ہے کوئی عبادت بھی اس کے مقابل نہیں اور بالاتفاق فرقہ اصنامیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ تارکِ صلوٰۃ "فاسق" ہے! اسلامی معاشرے میں اس کا کوئی مقام نہیں۔ نہ وہ قابلِ عقاب ہے نہ لائقِ اعتماد، نیز اس کی عیبت بھی جائز ہے۔

نماز کے سلسلہ میں بڑے سخت احکام ہیں۔ اصولاً پانچ قسم کی نمازیں واجب ہیں۔

فرائض پنجگانہ، نماز جمعہ، نماز عیدین، نماز آیات، نماز طواف لیکن بعض وقت خود مکلف کسی وجہ سے اپنے اوپر نماز

واجب کر لیتا ہے۔ مثلاً نذر مان کر قسم کھا کر یا کسی کی قضا نمازیں پڑھنے کی اجازت لے کر۔ ان کے علاوہ باقی سب نوافل ہیں۔ ہمارے ہاں نوافل میں سب سے اہم روزانہ نمازوں کے نافلے ہیں جو شمار میں واجب نمازوں سے دگنے ہیں۔ روزانہ کے فرائض و نوافل کی مجموعی تعداد اکیاون (۵۱) رکعت ہے۔

یہاں ہمیں ایک پُر لطف واقعہ یاد آگیا۔ راجب اصفہانی اپنی وقیع تصنیف "المحاضرات" میں لکھتے ہیں کہ۔ احمد بن عبد العزیز کے زمانے کی بات ہے۔ اصفہان میں کنانی نامی ایک شخص تھا جس سے احمد پیش نمازی کے آداب سیکھتا تھا۔ اتفاقاً ایک دن احمد کی ماں نے بھانک کر دیکھا، اور دیکھتے ہی کنانی سے کہنے لگی، "اُستاد محترم! آپ نے تو میرے لڑکے کو رافضی بنا دیا۔" کنانی نے بربتہ جواب دیا۔ "معظم! رافضی تو روزانہ اکیاون رکعتیں پڑھتے ہیں۔ اور آپکا لڑکا اکیاون دن میں ایک رکعت بھی نہیں ادا کرتا۔ یہ رافضی کیسے ہو سکتا ہے؟ اچھا! ان نمازوں کے علاوہ ماہِ رمضان امدم برسرِ مطلب کے نوافل کو بڑی عظمت و اہمیت



حاصل ہے، جن کی تعداد ایک ہزار رکعت ہے۔ ہمارے  
سُنّی بھائی بھی یہ نمازیں پڑھتے ہیں۔ مگر جماعت کے ساتھ جو ان  
کے ہاں تراویح کے نام سے مشہور ہیں۔

اور شیعی نقطہ نظر سے ان نمازوں میں جماعت  
مشرع نہیں، کیونکہ کلیہ یہ ہے کہ جماعت صرف واجب  
نمازیں ادا کرنے کے لئے ہے۔

تفصیلات کے واسطے ہماری فقہ کے وہ ہزاروں مجلدات  
دیکھے جاسکتے ہیں جو علمی دُنیا میں آپ اپنی نظیر ہیں۔ ان میں  
کمال شرح و بسط کے ساتھ نماز کے تمام متعلقہ احکام و  
اذکار، اور اُوراد، وادعیہ وغیرہ درج ہیں۔

فقہی طور پر ہمارے ہاں صحیح نماز کی حقیقت کے ثبوت  
کا دار و مدار ان تین امور پر ہے :

### ۱۔ شرائط نماز

وہ اضافی فتوے جو چند بیرونی حقائق سے مانو  
ہیں، اگرچہ ان میں سے کوئی بھی نفس نماز میں داخل نہیں  
لیکن یہ سب ایسی بندھنیں ہیں جن کے نہ ہونے  
سے نماز بالکل باطل ہو جاتی ہے۔

ان کی تعداد چھ ہے :

طہارت ، وقت ، قبلہ ، ساتر ، نیت ، مقام  
نماز کی جگہ کو اگرچہ کہ رکن کی حیثیت نہیں حاصل ہے  
لیکن اس کا مباح ہونا ضروری ہے۔ نیز اسی طرح جائے سجود  
کی پاکیزگی بھی لازم ہے۔

### ۲۔ اجزائے وجودی

وہ عناصر جن سے نماز کی صورت گری ہوتی ہے، ان کی  
دو قسمیں ہیں :

رُکنی — غیر رُکنی ،

رُکنی ، جن کے بغیر مطلق طور پر نماز باطل ہو جاتی ہے،  
یہ پانچ ہیں :

نیت<sup>(۱)</sup> ، تکبیرۃ الاحرام<sup>(۲)</sup> ، قیام<sup>(۳)</sup> ، رکوع<sup>(۴)</sup> ، سجود<sup>(۵)</sup>۔

غیر رُکنی یہ ہیں : قرات ، ذکر ، تشهد ، سلام ، ترتیب ، موالا۔  
طہانیت ان سب میں ضروری ہے۔

اذان و اقامت ، مستحب موکد ہیں ، بلکہ اقامت کا وجوب  
قوت سے خالی نہیں۔

### ۳۔ مبطلات

وہ امور جن کے ہوتے ہوئے نماز باطل ہو جاتی ہے،  
یہ بھی دو قسم کے ہیں :



رُکنی مطلقاً باطل کر دینے والے۔ یہ تعداد میں تین ہیں:

حدت، استدبار، عمل کثیر۔  
غیر رُکنی جنہیں قصداً اختیار کرنے سے نماز باطل ہو جاتی ہے، ان کی فہرست حسب ذیل ہے:  
بولنا، آواز سے ہنسنّا، اور اسی طرح رونا، دائیں بائیں دیکھنا، کھانا، پینا۔

طہارت سے مراد وضو اور غسل ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے واجب ہونے کے کچھ اسباب ہیں۔ لیکن پانی کی ناپسندیدگی یا کسی اور مجبوری جیسے بیماری، زیادہ سردی یا تنگی وقت وغیرہ کے باعث اس کا استعمال ممکن نہ ہو تو پھر ان کا بدل تیمم ہے۔  
فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا،  
(اور پانی نہ ملے) تو پاک مٹی سے تیمم کر لو۔

سُورَةُ نَسَاء - آیت : ۴۳

فقہاء اور ارباب لغت نے صعيد کے معنوں میں اختلاف کیا ہے۔ کچھ تو کہتے ہیں کہ اس سے مقصود صرف مٹی ہے بعض کے خیال میں بغیر کسی قید و شرط کے رُوئے زمین مراد ہے جس میں ریت، سنگریزے، پتھر اور غیر سوختہ معدنی اشیاء وغیرہ سب شامل ہیں۔

نماز کے بارے میں یہ مختصر سی گفتگو تھی۔  
اس سلسلے میں بڑے زبردست اور طویل مباحث ہیں جن کے لئے جلدیں کی جلدیں درکار ہیں۔



## ★ روزہ

امامیہ عقیدے کے مطابق روزہ شریعت اسلامیہ کا ایک رکن ہے۔ احکام کے لحاظ سے صیام کی چار قسمیں ہیں۔ واجب مستحب، حرام، مکروہ۔ واجب روزے دو قسم کے ہوتے ہیں:

- (۱) شرع کے واجب کردہ۔ یہ ہیں ماہ رمضان کے روزے۔
  - (۲) جو کسی سبب سے واجب ہو گئے ہوں جیسے صوم کفارہ، بدل ہدی، نیابت اور نذر وغیرہ کے روزے۔
- رجب و شعبان کے روزے مستحب ہیں: نیز ان کے علاوہ اور بہت سے سنتی روزے ہیں۔

عیدین اور آیام تشریق کے روزے حرام ہیں۔ نیز صوم عاشور اور عرفہ کے دن روزہ رکھنا مکروہ ہے۔

صیام کے کچھ شرائط ہیں، واجبات و مبطلات ہیں اور آداب و اذکار ہیں، اس موضوع پر بھی ہزاروں کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے۔

رمضان المبارک کے روزوں کا شیعہ اس قدر التزام

کرتے ہیں جس کی کوئی حد نہیں۔ بہت سے لوگ تو مرض موت اور حبان لیوا پیاس میں بھی اس عبادت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

نماز اور روزہ خالص جہانی عبادتیں ہیں۔



## ★ زکوٰۃ

شیعوں کے نزدیک نماز کے بعد زکوٰۃ کا مرتبہ ہے بلکہ آئمہ اطہار کی بعض حدیثوں میں یہ مضمون ملتا ہے کہ جو زکوٰۃ نہ دے اس کی نماز ہی درست نہیں۔  
عساکر مسلمانوں کی طرح امامت کے حضرات بھی تو چیزوں پر زکوٰۃ واجب سمجھتے ہیں۔

مواشی میں — اُونٹ، گائے، بھینس، بھیڑ، بکریاں، غلوں میں — گھوڑوں، جو، خربا، مویر (منقہ) نقدی میں — طلائی سکہ، نقرئی مسکوکات۔  
ان کے علاوہ تجارتی سامان، گھوڑوں نیز زمین سے پیدا ہونے والی تمام اشیاء جیسے دالوں اور ترکاریوں وغیرہ کی زکوٰۃ نکالنا مستحب ہے۔

وجوب و استحباب کے کچھ شرائط و ضوابط ہیں، جو اپنے اپنے مقامات پر مذکور ہیں۔ اس سلسلے میں بیشتر قواعد مذاہب اربعہ یعنی حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی فقہ کے مطابق ہیں۔

زکوٰۃ کے مستحق حسب ارشاد باری تعالیٰ :  
اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ... تا آخر آیت  
فقرار و مساکین ہی ہیں — (سورۃ توبہ - آیت : ۶۰)

## ★ زکوٰۃ فطرہ :

فطرہ ہر اُس بالغ و عاقل شخص پر واجب ہے جو خود یا کسی دیگر شخص کے ذریعہ یا اپنے اہل و عیال اور دوسرے تمام متعلقین کا معاشی بار اٹھانے کی سکت رکھتا ہو۔

اس کی مقدار ہر فرد کی جانب سے گھوڑوں، جو، یا کھجوروں کا ایک صاع ہے۔ یہاں بھی شیعہ مسائل سنیلوں سے مختلف نہیں ہیں۔



## ★ خمس

خمس سات چیزوں پر واجب ہوتی ہے۔  
دار الحرب کا مال غنیمت، غنواہی (غوطہ زنی) سے،  
حاصل شدہ جواہر و معادن و نباتات، پوشیدہ خزانے،  
معدنی اشیاء، حلال حرام آمیز کاروبار کے منافع مسلم سے  
ذمی کو منتقل شدہ آراضی۔

خمس کی اصل و اساس پروردگار عالم کا یہ ارشاد ہے:  
وَأَعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّن شَيْءٍ فَإِنَّ لِلَّهِ  
خُمُسَهُ وَ لِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ  
وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۚ لَهُ

”آگاہ ہو کہ جو اموال بطور غنیمت تمہیں دستیاب ہوں  
ان کا پانچواں حصہ خدا، رسول، ذی القربی، یتام، مسکین  
اور پردیسیوں کا ہے“

اس ضمن میں ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ خمس وہ حق ہے  
جسے خداوند کریم نے ”ال محمد“ کے لئے مختص فرمایا ہے

کیونکہ نبی زادوں پر صدقہ حرام ہے، لہذا وہ زکوٰۃ نہیں  
لے سکتے، ان کے لئے پروردگار عالم کی یہ عنایت اسی کا  
نعم البدل ہے۔

خمس کے چھ حصے ہوتے ہیں۔ تین۔ اللہ، رسول اور  
ذی القربی کے، جنہیں موجودگی کی صورت میں امام علیہ السلام  
کی خدمت اقدس میں پیش کرنا واجب ہے اور غنیمت کی شکل  
میں یہ نائب امام یعنی مجتہد عادل کے حوالے ہوں گے،  
تاکہ ان محاصل سے وہ دین مبین کی حفاظت اور ملت نغرا  
کے ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل فرما سکیں۔ یہ ہے اس کا  
حقیقی مصدق۔ نہ کہ وہ جسے سید محمود الوسی کی ذہنی بد  
کھنا چاہیے۔

سید صاحب مذکور اپنی تفسیر میں ایک جگہ پر مزاحاً  
تحریر فرماتے ہیں کہ۔۔۔ اس زمانے میں تو ایسے حقوق کو  
سہراب میں رکھ دینا چاہیے۔

یہ دراصل اشارہ ہے اُس غلط افسانے کی طرف جو ان کے  
باپ دادا سے نقل ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس قوم کے ہر چھوٹے  
بڑے سے سن لیجئے۔ شیعہ کہتے ہیں..... ان کے امام



سرداب میں غائب ہو گئے۔ حالانکہ سرداب کو غیبت سے کوئی ربط ہی نہیں۔ اثنا عشری حضرات تو اس لئے سامرہ کے تہ خانے کی زیارت کو جاتے ہیں کہ یہ امام ہمام کے تہجد کی جگہ تھی۔ نیز حضور کے پدر بزرگوار اور جدِ عالی تبار بھی اسی مقام پر عبادتِ الہی میں مشغول رہتے تھے۔

خمس کے باقی تین حصص ہاشمی محتاجوں کا حق ہیں، یہ تھے ائمائے مذہب کے احکامِ خمس جو عہد رسالت سے لیکر اب تک نافذ العمل ہیں۔ لیکن آنحضرتؐ کے بعد مسلمانوں نے آلِ ہاشم کا حق چھین کر بیت المال میں جمع کر دیا۔ یہ گھرانہ زکوٰۃ تو لے ہی نہیں سکتا تھا، خمس سے بھی محروم ہو گیا!

غالباً امام شافعی نے اپنی کتاب الامم کے صفحہ ۶۹ پر اس جانب اشارہ کیا ہے کہ آلِ محمد جن کے لئے صدقے کی جگہ خمس مقرر ہوئی تھی نہ انھیں مقررہ صدقات میں سے کچھ مل سکتا ہے اور نہ وہ لے سکتے ہیں۔ نیز اگر دینے والا جانے کے باوجود دے بھی دے تو اسے ثواب سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ آگے چل کر آپ فرماتے ہیں: اگر حق خمس سے انھیں محروم کر دیا گیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ صدقہ و عیترہ جو

ان کے لئے حرام ہے، وہ اس جہت سے حلال ہو جائے گا۔ ہاں! چونکہ مہربانوں نے حق ہی ساقط کر دیا، اس لئے سوادِ اعظم کے فقہی مجموعوں میں ہرے سے یہ موضوع ہی ناپید ہے، اور انتہا یہ کہ خود امام شافعی کی کتاب بھی اس مبحث سے خالی ہے۔ البتہ شیعہوں کی ہر چھوٹی بڑی تصنیف میں زکوٰۃ وغیرہ کی طرح خمس کو بھی ایک مُتَقَلِّ عنوان کی حیثیت حاصل ہے لہ

لہ البتہ فاضل محترم حافظ ابو عبیدہ القاسم بن سلام (متوفی ۲۲۴ھ) نے اپنے عظیم شاہ کار کتاب الاموال کے ایک مُتَقَلِّ باب میں خمس کے تمام اصناف، احکام اور مصارف پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور بحث کے بیشتر اجزاء شیعہ مسائل سے اتفاق کرتے ہیں۔



## حج

شیعہ عقائد میں حج اسلام کا بہت بڑا ستون ہے۔ اس فریضہ کے ترک کرنے والے کو پاداشِ جہنم میں یا تو یہودیوں کی طرح مرنا ہوگا، یا نصاریٰ کی سی موت قبول کرنا پڑے گی۔ اس سے روگردانی کفر کی حدوں کو پہنچا دیتی ہے، آیہ مبارکہ وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ کا اشارہ اسی جانب ہے۔ حج ایک قسم کا مالی اور جسمانی جہاد ہے۔ بلکہ حج کو واقعی جہاد، اور جہاد کو حقیقی حج کہنا چاہئے۔ ذرا غور و فکر سے کام لیا جائے تو ان دونوں کی یگانگت سمجھ میں آجائے گی۔ حج کے اقسام

۱۔ حج افراد: حسب ارشاد: وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَى سَبِيلِهِ (بہو لوگ پہنچنے کی قدرت رکھتے ہوں، خدا کے واسطے ان پر حج واجب ہے)۔ آل عمران - آیت: ۹۷

۲۔ استطاعت کے باوجود حج سے انکار کرنے والے کو خیال ہونا چاہئے کہ اللہ سے جہان سے بے نیاز ہے: (سورۃ آل عمران - آیت: ۹۷)

۲۔ حج قرآن: جس کی اس آیت میں تصریح ہے:

وَأَسْتَوُوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ

خدا کے لئے حج اور عمرہ کو پورا کرو۔ (البقرہ: آیت: ۱۹۷)

۳۔ حج تمتع: بمفاد آیہ کریمہ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ

إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ

(پس جو شخص حج تمتع کا عمرہ بجالائے اسے جو قربانی میسر

ہو، وہی پیش کر دے) (البقرہ - آیت: ۱۹۷)

ان میں سے ہر ایک کے بڑے بڑے مباحث اور طویل طویل احکام ہیں جو فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں۔

ہم علمائے اہل سنت کی بہت سی کتابوں کا مطالعہ

کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس سلسلہ میں ان کے

اکثر مسئلے ہمارے مسائل سے میل کھاتے ہیں۔ ہاں! کہیں کہیں

اختلاف ہے مگر بہت کم۔ شیعہ حج کو کافی اہمیت دیتے

ہیں اور ادائیگی فرض کا حد درجہ خیال رکھتے ہیں جس زمانے

میں جان ہتھیلی پر رکھ کر یہ راہیں طے کرنا پڑتی تھیں، قدم

قدم پر ان لوگوں سے سابقہ پڑتا تھا، جو ان کے خوض کے

پیاسے اور عزت و ناموس کے دشمن تھے۔ ان وقتوں میں بھی

اس مخلص گروہ نے خطروں سے بے پروا ہو کر لاکھوں کی



تعداد میں خانہ کعبہ کا طواف کیا۔ جان و مال کے اندیشوں سے ہمتیں نہیں پست ہوئیں۔ واجبات کا احساس قدم بڑھاتا ہی رہا۔ حج کیا اور بڑی بڑی قیمتیں دے کر کیا۔ مگر افسوس اس کے باوجود یہ کہا جاتا ہے کہ "شیعہ اسلام کی تخریب چاہتے ہیں۔"

## ★ جہاد

"جہاد" اسلام کی عالی شان عمارت کا سنگِ بنیاد ہے۔ یہ نہ ہوتا تو دین حق نہ دنیا کے لئے وجہ رحمت بنتا اور نہ انسانیت کے واسطے باعثِ برکت ثابت ہوتا۔ ظلم اور ظالموں کی مقاومت اور فتنہ و فساد کی روک تھام کے لئے جان و مال کو راہِ خدا میں قربان کرنے کا نام جہاد ہے۔

مذہبِ شیعہ میں اس کی دو قسمیں ہیں :

☆ جہادِ اکبر

☆ جہادِ اصغر

اس باطنی دشمن کا مقابلہ جسے "نفس" کہتے ہیں، اور اس کے بُرے اثرات یعنی جہالت، بُزدلی، جور و جفا اور رشک، نخوت وغیرہ سے برہنہ پیکار ہونا جہادِ اکبر ہے۔ سب سے بڑا عَدُو، وہ نفس ہے جو تمہارے پہلو سے لگا ہوا ہے۔ او جہادِ اصغر مراد اس ظاہری دشمن کی مدافعت ہے جسے عدل و انصاف، امن و شرافت اور دین و حقیقت سے بیرہو۔



## ★ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ★

واجبات شرعیہ کا اہم ترین عنوان، فرائض عقتل کا سب سے بڑا موضوع، حق و حقیقت کی طرف بلانے کا موثر ذریعہ، کفر و باطل کو مٹانے کا کامیاب حربہ! جس قوم نے بھی اس مقدس قانون سے غفلت برقی، وہ آپ اپنے ہاتھوں برباد ہوئی، بلکہ ستمگاریوں اور شریک کاریوں کی جولاں گاہ بن کر رہ گئی۔

اسی لئے صاحب شریعت صلوٰۃ اللہ علیہ اور ہمارے آئمہ معصومین علیہم السلام نے اس ضمن میں بہت تاکید فرمائی ہے۔ جگہ جگہ اس کی پابندی کے فوائد اور نظر انداز کر دینے کے پُرہول عواقب سے آگاہ کیا ہے۔ آج ہم ان ارشادات کی صداقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، سامنے کی باتیں ہیں، غیاں راچہ بیاں! بہر حال! — امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، کو تو ہم چھوڑ ہی بیٹھے۔ مگر کاش یہ غفلت یہیں تک رہے۔ اس

منزل تک نہ پہنچنے پائے کہ ”معروف“ منکر اور ”منکر“ معروف بن جائے۔ رہبری کی رسم اٹھ گئی۔ آگے خدا حافظ ہے! اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ! اب تو یہ اندیشہ لاحق ہے کہ ہمیں خود رہنما نہ بھٹکت جائیں ظہر الفساد فی البرِّ وَالْبَحْرِ! بروجر میں فساد رونما ہو گیا! نتیجہ تباہی اور مکمل تباہی!

خداوند عالم بے عمل ناصحوں اور بدکردار و اعطوں پر لعنت بھیجتا ہے۔

شیعی مسلک میں مذکورہ عبادتیں ”امہات العبادات“ اساسی عبادتیں کہلاتی ہیں، جن کے سلسلے میں ہم نے صرف اشارے کئے ہیں تفصیل مطلوب ہو تو صدر اول سے لیکر عصر حاضر کے علما تک کی قابل قدر عظیم تصنیفات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ہمارے شاہکار مٹنے کے باوجود اب بھی لاکھوں مجتہدات کی صورت میں فیض رساں ہیں۔



## ★ معاملات

معاملوں میں دو فریقوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک قبلوانے والا، اور دوسرا قبولنے والا (ایجاب و قبول شرط لازم ہے) معاملات کبھی تو صرف مالی نوعیت کے ہوتے ہیں، جیسے خرید و فروخت، اجارہ و رہن، قرض و ہبہ اور اجرت وغیرہ۔

فقہ کی تمام کتابوں میں پوری شرح و بسط کے ساتھ ان کے جملہ متعلقات کا ذکر موجود ہے۔

معاملات کی دوسری شکل میں مال و دولت تو ضمنی حیثیت رکھتے ہیں اور اصل مقصد تدبیر منزل، افزائش نسل اور بنائے نوع ہوتا ہے۔ جیسے عقود زواج یعنی ازدواجی معاہدے۔ ہمارے ہاں ان معاہدوں کی دو قسمیں ہیں:

(۱) عقد دوام

(۲) عقد منقطع

عقد دوام کہتے ہیں اُس نکاح کو جو مطلق و مرسل ہو۔ بالفاظ دیگر اس میں کسی وقت وغیرہ کی شرط موجود نہ ہو۔

بمفاد آیہ مبارکہ وَأَنْتُمْ حُورٌ أَلَا يَأْمُرُ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ لَهُ اور عقد منقطع کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مقید و موقت ہو۔ یعنی اس میں کسی مدت کا لحاظ رکھا جائے۔

نکاح کی پہلی قسم سے تو تمام مسلمان متفق ہیں مگر دوسری قسم کو جسے حسب فرمان خداوند کریم فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ لَہ نکاح متعہ بھی کہا جاتا ہے سوائے شیعہوں کے اور کوئی جائز نہیں سمجھتا۔ صرف شیعہ ہی اس کی مشروعیت کے قائل ہیں۔ نیز عہد صحابہ سے لے کر اب تک یہ مسئلہ موضوع بحث بنا ہوا ہے چنانچہ معاملے کی اہمیت کے پیش نظر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس کے بعض پہلوؤں کو اجاگر کرتے چلیں۔

## ★ بحث متعہ

واقعہ یہ ہے کہ ہر وہ شخص جسے ذرا بھی مذہب اسلام کو سمجھنے کا موقع ملا ہے اور جس نے بھی دینی قوانین کے مطالعہ میں زندگی کے کچھ لمحے صرف کئے ہیں، وہ اس

۱۵ سورۃ نور - آیت: ۳۲

۱۶ سورۃ نسا - آیت: ۲۴



حقیقت سے قطعاً انکار نہیں کر سکتا کہ متعہ کے معنی وہ عقد ہے جو ایک بندھے کے وقت کے لئے ہو۔ خود پیغمبر اکرمؐ نے اس قسم کے عقد کو رائج کیا مباح فرمایا۔ اور حیاتِ رسولؐ میں بڑے بڑے صحابہ اس پر عمل پیرا ہوئے۔ نیز اس حضرت کی وفات کے بعد بھی صحابہ کرام قانون کی اس شق سے جی بھر کر متمتع ہوتے رہے۔ چنانچہ عبد اللہ بن عباس، جابر بن عبد اللہ انصاری، عمران بن حصین، ابن مسعود اور ابی ابن کعب وغیرہم یہ تمام اعظم و مشاہیر متعہ کے جواز کا فتویٰ دیتے تھے، اور آیت متعہ کو اس طرح پڑھتے تھے۔

”فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى“  
لیکن ہماری رائے میں یہ یقین کرنا درست نہ ہوگا کہ یہ حضرات اللہ کے کلام میں کسی نقص و تحریف کے قائل تھے (معاذ اللہ) نہیں۔ بلکہ غالباً سخن شناس ہونے کی وجہ سے تفسیر کے طور پر اس جزو کے ذریعے آیت کا منشاء بیان کرتے ہوں گے چونکہ عرصہ دراز تک یہ بزرگ شیعہ نبوت کا طواف کرتے رہے۔ انھیں معارفِ قرآنی کو زبانِ رسالت سے سننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

لہذا جب لوگ ان سے دریافت کرتے ہوں گے تو اس آیت کے سلسلے میں ختمی مرتبتؑ سے حاصل کردہ مفہوم کو ظاہر کر دینے میں انھیں کوئی تاثر نہ ہونا ہوگا۔

حالانکہ ابن جریر نے اپنی تفسیر کبیر میں جو روایتیں درج کی ہیں ان سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ الیٰ اَجَلٍ مُّسَمًّى والاثر آیت کا حصہ ہے۔ چنانچہ موصوف البونصرہ کی زبانی نقل کرتے ہیں کہ میں نے اس آیت کو ابن عباس کے سامنے پڑھا تو آپ نے فرمایا الیٰ اَجَلٍ مُّسَمًّى۔ میں نے عرض کی کہ میں تو یوں نہیں پڑھتا۔ اس پر ابن عباس نے تین مرتبہ فرمایا۔ بخدا یہ آیت اسی طرح نازل ہوئی ہے!۔ لیکن یہاں بھی ہم عرض کریں گے کہ زیست حضرت ابن عباسؓ کا مقام ان نقائص سے بہت بلند ہے یہ روایت اگر صحیح ہے تو غالباً رسولؐ کے اس جلیل القدر صحابی کا مقصود یہ ہوگا کہ پروردگارِ عالم نے اس کی تفسیر یوں نازل فرمائی ہے۔

بہر حال اجماع و یقین۔ متعہ کی صحت و مشروعیت کا بین ثبوت ہیں۔ اب رہا مخالفتِ نظریہ رکھنے والوں کا ادعا تو اس میں وزن ہی کیا۔ کیونکہ وہ فرماتے ہیں کہ یہ قانون



نافذ ہو کر منسوخ ہو گیا۔ حالانکہ نقل کے طریقے میں جو اختلافات نمایاں ہیں وہ قطع و یقین تو درکنار ظن و تخمین کے لئے بھی ناکافی ہیں۔ دیکھتے بنیادی معاہدہ یہ ہے کہ حکم قطعی کئی نسخ کے لئے دلیل قطعی کا ہونا ضروری ہے اور ان حضرات کا ارشاد ہے کہ نسخ سنت کے طریقہ سے عمل میں آئی۔ سرکار رسالت نے مباح فرما کر حرام قرار دے دیا بعض فرماتے ہیں کہ نہیں، کتاب خدا کے ذریعہ حرمت کے پہرے بیٹھ گئے۔ نیز اس منزل پر بھی اتحاد و مکر عتقا ہے، کیونکہ ایک گروہ آیت طلاق کو نسخ سمجھتا ہے اور دوسرا آیہ موارد کو۔ اب ان پریشاں خیالیوں کی جو قیمت ہو سکتی ہے وہ ظاہر ہے۔ بنا بریں یہاں فرید خامہ فرسائی کی ضرورت نہیں۔ آگے چل کر قدرے توضیح کی جائے گی۔

ہاں! اور اکثر بزرگ اس آیت سے متعہ پر خط نسخ پھیرتے ہیں۔

إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ ۖ  
آیت میں حلت کے دو سبب بتائے گئے ہیں :

۱۔ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ (سورۃ نسا، آیت: ۱۲)  
۲۔ سُوْرَةُ تَوْنُوْنِ - آیت: ۶ و سُوْرَةُ مَعَارِجِ - آیت: ۳۰

۱۔ زوجیت

۲۔ ملکیت

چنانچہ اس موقع پر سید الوسی ترقیم فرماتے ہیں کہ :  
”شیعہ حضرات ممتوعہ کو مملوکہ (کینز) قرار نہیں دے سکتے۔ یہ تو ایک کھلی ہوئی بات ہے، اور زوجہ کہہ نہیں سکتے۔ کیونکہ اس میں زوجیت کے شرائط یعنی میراث، عدہ اور نفقہ و طلاق کا فقدان ہے۔“

غور فرمائیے، دلیل میں کتنا زبردست مغالطہ ہے۔ اب ذرا تجزیہ کیجئے۔ پہلی چیز میراث۔ اگر زوجیت کے لئے اس شرط کو عمومی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یعنی اکثر ایسا ہوتا ہے کہ زوجہ ورثہ پاتی ہے تب تو ٹھیک ہے لیکن غالباً سید صاحب کا یہ منشاء نہیں، اور اگر یہ مراد ہے کہ میراث شرط لازم و دائم ہے یعنی بہر صورت ورثہ ملنا چاہئے تو یہ قطعی طور پر خلاف آئین ہے۔ کیونکہ شریعت میں اکثر ایسے مواقع آتے ہیں جہاں میراث ختم ہو جاتی ہے۔ مثلاً زوجہ کافرہ اور فتانکہ کو ورثہ نہیں ملتا۔ نیز ایسی عورت جو کسی مریض کے عقد میں چلی جائے اور دخول سے پہلے اس کے



شوہر کا انتقال ہو جائے تو وہ بھی محسُوم ہو جاتی ہے نیز برخلاف اس کے اگر کوئی شخص بیماری کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دے دے اور اسی مرض کے عالم میں اس کا انتقال ہو جائے تو عدہ کی مدت گزارنے کے باوجود دورانِ سال میں مطلقہ ورثے کی حقدار ہوگی۔ غرضیکہ دونوں رُخ سامنے ہیں، اور صاف ظاہر ہے کہ ارث کو لازماً زوجیت نہیں قرار دیا جاسکتا۔

رہا عدت کا لزوم تو امامیہ مذہب میں بالاتفاق ثابت ہے بلکہ جو بھی مشروعیتِ متعہ کا قائل ہے وہ عدت کو واجب قرار دیتا ہے۔ تیسری چیز نفقہ ہے۔ اسے بھی شرطِ زوجیت نہیں بنایا جاسکتا۔ اطمینان کے لئے زنِ ناشنہ کے احکام کو دیکھ لیجئے کہ وہ زوجیت میں ہوتی ہے مگر بالاتفاق اس کے نفقہ کو کوئی واجب نہیں سمجھتا۔

باقی رہا طلاق کا معاملہ۔ تو اس سلسلے میں مدت کا بخش دینا کافی ہے۔

دوسری بات یہ کہ ازواج کی آیت سے متعہ کی فسوخی محال ہے۔ کیونکہ آیتِ متعہ سورۃ نساء میں ہے جو مدنی ہے۔ اور آیۃ ازواج سورۃ مومنین و معارج میں ہے اور

دونوں مکی ہیں۔ بنا بریں نسخ ثابت ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ منسوخ پر نسخ کا تقدم غیر ممکن ہے۔

تیسرے یہ کہ اکابر اہل سنت بیان فرماتے ہیں کہ آیت متعہ منسوخ نہیں ہوئی۔ ملاحظہ ہو کشاف زخشری ابن عباس سے نقل کرتے ہیں کہ متعہ کی آیت محکمات میں سے ہے دوسروں نے روایت کی ہے کہ حکم ابن عتبہ سے دریافت کیا گیا کہ آیت متعہ کیا منسوخ ہو گئی ہے؟ جواب ملا نہیں!

غرضیکہ پہلے تو جمہور اسلام نے اس کی مشروعیت کا اعتراف کیا لیکن بعد میں منسوخ ہونے کے دعوے کرنے لگے، اور طریق نسخ میں جو قیاس آرائیاں فرمائی ہیں وہ بھی قابلِ دید و شنید ہیں۔ کبھی تو آیت کو آیت کے ذریعہ منسوخ فرمانے کی کوششیں ہوئیں (ضعف دلیل کی جانب اشارہ کیا جا چکا ہے) گاہے آیت کو حدیث سے ختم کرنے کی سعی فرمائی گئی۔ اس ضمن میں صحیح بخاری و مسلم کی اس روایت سے استشہاد کیا جاتا ہے کہ

فتح مکہ، فتح خیبر یا غزوۃ او طاس میں آنحضرت نے اسے ممنوع قرار دے دیا تھا اور یہی وہ مقام ہے جہاں یہ معاملہ



آماجگاہ اختلاف بنتا ہے۔ نہ جانے کتنے رنگ چڑھتے ہیں اور کیا کیا پلنٹرے بدلے جاتے ہیں۔

چنانچہ متاضی عیاض کی زبانی بیان کیا جاتا ہے :  
” بعض علماء کا ارشاد ہے کہ نکاحِ متعہ دو دفعہ حرام، مُباح اور منسوخ ہوا۔“

لیکن آنکھ بھر کر دیکھنے والے جانتے ہیں کہ ان حضرات نے اپنی علمی دنیا میں کیا کیا گل کھلائے ہیں۔

بعض کتابوں میں لکھا ہے کہ حجۃ الوداع ۱۱ھ میں منسوخ کیا گیا۔ دوسرے مصنفات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہیں غزوہ تبوک ۹ھ میں تسخیر ہوئی۔ کچھ قلم کاروں نے غزوہ اوطاس اور غزوہ حنین شوال ۸ھ کا حوالہ دیا ہے مگر ایک اور گروہ فتح مکہ رمضان ۸ھ کا واقعہ بتاتا ہے۔

نیز یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آنحضرتؐ نے فتح مکہ کے موقع پر جائزہ فرما دیا تھا، اور پھر چند دن بعد وہیں اس کی حرمت کا حکم صادر فرما دیا۔ البتہ شہرت اور غالب رائے یہ ہے کہ متعہ کی تسخیر غزوہ خیبر یا عمرہ القضاء ۸ھ میں عمل میں آئی۔

بہر کیف! اس محشر خیال سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے

کہ دو یا تین دفعہ نہیں (جیسا کہ نو دوی شارح مسلم نے ترقیم فرمایا ہے) بلکہ پانچ چھ مرتبہ حرامِ حلال کا کھیل تھا رہا، کیوں؟ علمائے اسلام! بازی بازی بادیں خدا ہم بازی؟ یہ کیا اندھیر ہے؟ سچ کہنا اس درجہ فکری انتشار کے ہوتے ہوئے تمہارے ادعائے نسخ میں کوئی جان باقی رہ جاتی ہے؟

یہ ناقابل انکار حقائق ہیں کہ :

- (۱) قرآنی احکام انجبارِ آحاد سے منسوخ نہیں ہو سکتے۔
- (۲) نسخ کی دلیلیں خود سوادِ اعظم کی روایات عدم نسخ سے متصادم ہوتی ہیں۔

(۳) صحیح بخاری کی روایت ہے ابو رجا، عمران بن حصین ناقل ہیں کہ آیہ متعہ قرآن میں موجود ہے۔ رسولؐ کے ہوتے ہوئے ہم نے اس پر عمل کیا۔

پھر نہ قرآن نے اس کی حرمت کا حکم دیا، اور نہ آخر وقت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہاں! ایک شخص نے من مانی کی۔ جو چاہا کہہ دیا۔ محمدؐ کا قول ہے کہ اس حرکت کو حضرت عمرؓ کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔  
نیز صحیح مسلم میں عطل کے حوالے سے لکھا ہے کہ :



" ایک مرتبہ جابر ابن عبد اللہ انصاری عمرہ  
بجالانے کے لئے آئے تو ہم سب ان کی  
قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ لوگوں نے ان سے  
مختلف مسائل پوچھے۔ چنانچہ متعہ کے متعلق  
بھی دریافت کیا۔ جابر نے کہا۔ ہاں! عہد  
رسالت میں ہم نے متعہ کیا، اور ابوبکر و عمر  
کے زمانے میں بھی! "

مسلم کی ایک اور روایت ہے، اور حضرت جابر ہی کی زبانی  
فرماتے ہیں:

" دور نبوی میں تو ہم ایک مٹھی کھجور، اور  
مٹھی بھرتو دے کر متعہ کر لیا کرتے تھے "

علاوہ ازیں صحیح مسلم کے اوراق میں یہ بھی موجود ہے۔

" ابونضرہ بیان کرتے ہیں کہ میں جابر ابن عبد اللہ انصاری  
کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اتنے میں ایک اور آدمی آگیا، او  
آتے ہی کہنے لگا، متعوں کے بارے میں تو ابن عباس اور  
ابن زبیر کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا ہے؟ جابر  
نے فرمایا:

" رسالت مآب کی موجودگی میں تو ہم ان سے پر

عمل پیرا تھے، لیکن بعد میں عمر نے ممانعت

کردی۔ اس لئے پھر نہ کر سکے۔ "

جی ہاں! اس لئے پھر نہ کر سکے کہ حضرت عمر متعہ کرنے والوں  
کو سنگسار کروا دیتے تھے۔

واقعہ یہ کہ صحیح مسلم کے اس حصے کو اگر غور سے  
دیکھا جائے تو تضاد بیانی کے ایسے ایسے عجوبے نظر آتے  
ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ادھر مثبت حدیثیں ادھر منفی  
روایتیں۔ یہاں نسخ کے دعوے وہاں عدم نسخ کے ثبوت،  
اور سنئے! جہنی فرماتے ہیں کہ:

" فتح مکہ کے موقع پر خود آنحضرت نے ہمیں

متعہ کا حکم دیا تھا، لیکن ہم وہاں سے نکلنے

بھی نہ پائے تھے کہ سرکار رسالت نے اس

کی ممانعت فرمادی۔ "

تسخیر کی نسبت کبھی پیغمبر اکرم کی طرف گاہ حضرت عمر کی جانب  
مزید برائیں عہد نبوی اور پہلی خلافت کے زمانے میں عقد  
متعہ رائج تھا، اور یہ بھی کہ حضرت علی علیہ السلام نے  
متعدد مواقع پر جناب ابن عباس کو متعہ کے بارے میں



گفتگو کرنے سے منع فرمایا۔ چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے اپنی رائے بدل دی۔

مگر اس کے ساتھ یہ روایت بھی ملتی ہے کہ ابن زبیر نے ایک مرتبہ مکہ میں اٹھ کر فرمایا تھا:

”کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ خداوندِ عالم نے جس طرح ان کی بصارت چھینی، اسی طرح ان کی بصیرت بھی سلب کر لی۔ وہ متعہ کا

فتویٰ دیتے پھرتے ہیں!“

(یہ اشارہ ابن عباس کی طرف تھا، جو نابینا ہو گئے تھے) اس پر ابن عباس نے آواز لگائی۔ ہاں!

”قسم کھا کر کہتا ہوں کہ متعہ امام المتقین کے زمانے تک رائج تھا۔“

اس سے صاف ظاہر ہے کہ عبداللہ ابن عباس نے کبھی بھی اپنی رائے نہیں بدلی، بلکہ وہ زندگی بھر، تادورِ خلافت ابن زبیر اپنے فتوے پر قائم رہے۔

اور سب سے زیادہ پُر لطف بات تو یہ ہے، کہ امتناعی حکم کو جناب امیر علیہ السلام سے بھی منسوب

کیا گیا ہے۔ حالانکہ عقدِ متعہ کو جائز قرار دینا اہل بیت علیہم السلام کا امتیازی مسلک ہے۔ پھر خصوصیت سے اس ضمن میں امیر المومنین علیہ السلام کا یہ ارشاد کہ:

”اگر عمر نے متعہ کو ممنوع نہ کیا ہوتا تو گنتی

کے (یا گئے گزرے) کچھ لوگ ہی زنا کے

مترکب ہوتے۔“

ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ طبری نے اپنی تفسیر میں بھی

اس روایت کو نقل کیا ہے۔ اس سلسلے میں باوثوق ذرائع

سے امام جعفر صادق علیہ السلام کا یہ قول ملتے ہیں کہ:

”تین مسئلوں میں کسی کی پروا نہیں کرتا

متعہ الحج، متعہ النساء، اور مسح بر کفش“

بہر طور فقہی قاعدوں اور اصولِ فقہ کے مقررہ ضوابط کی

رُوسے یہ طے شدہ بات ہے کہ ادھر روایتوں میں تضاد

پیدا ہوا، اور ادھر وہ درجہ اعتبار سے ساقط ہوئیں کیونکہ

مشکوٰۃ روایتیں قابل انکار اور ان کے مقابلے میں محکم

حدیثیں لائق عمل ہوتی ہیں۔

نیز جب کہ علمائے اسلام کے متفقہ فیصلے اور فقہی

تکنیک کے مطابق متعہ کی مشروعیت اور اس کا جواز ثابت۔



ہے تو آج بھی اس کی اباحت کا اقرار کرنا پڑے گا،

## ★ مسئلہ کا واحد حل

اب اگر ہم حقائق کی روشنی میں جائزہ لیں معاملہ کی پوری چھان بین کریں اور اس کی تمام کڑیوں کو ملا کر صحیح نتیجہ نکالنا چاہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حضرت عمرؓ نے اپنے دور حکومت میں کسی خاص مصلحت کے پیش نظر اپنی رائے سے متعہ کو ممنوع قرار دے دیا تھا، لیکن یہ ممانعت قطعی طور پر سماجی حالات اور وقتی تقاضوں پر مبنی تھی۔ دین، مذہب کا اس سے کوئی سروکار ممکن نہیں چنانچہ تو اتر کے ساتھ آپ کا یہ قول نفل ہوتا چلا آ رہا کہ:

”رسول کے زمانے میں دو متعہ جائز تھے، مگر میں انہیں حرام قرار دیتا ہوں“ اور خلاف ورزی پر سزا دوں گا،“

یہاں غور طلب چیز یہ ہے کہ خلیفہ ثانی نے حرمت یا نینس کے حکم کو سرکار رسالت کی جانب نہیں منسوب کیا۔ بلکہ خود اپنی ذات کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ نیز سزا کا تعلق بھی اپنے ہی سے رکھا۔ خدا سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہی اس مسئلہ کا واحد حل ہے

ورنہ پھر ان خطوط پر سوچنا پڑے گا کہ حضرت عمرؓ جتنی شخصیت اور دین الہی میں بے محابانہ کتر، بیونت! لیکن مسلمانوں کی تاریخ میں آپ کے مقام کو دیکھتے ہوئے اس انداز فکر کا اختیار کرنا کس قدر مشکل ہے۔

کیا حضرت عمرؓ عمر یہ نہیں جانتے تھے کہ مُحْتَمَد کا حلال قیامت تک حلال، اور حضورؐ نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے وہ تاحشر حرام رہیں گی؟

”خُذُوا مِنْ دَعْوَانِمْ خُودِ اِنِّمْ جَبِيْبٌ سَے فرماتا ہے کہ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۚ لَا خُذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۚ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۚ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حَاِجِزِيْنَ ۚ“

”اگر رسول ہمارے متعلق کچھ باتیں گھڑ لیتا تو ہم اس کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے اور پھر گلا کاٹے بغیر نہ چھوڑتے، اور پھر یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ تم میں سے کوئی آکر بچا لیتا۔“ (الحاقة: آیت: ۲۴ تا ۲۷)

بہر طور یہی بہتر تھا کہ حضرت عمرؓ کے امتناعی حکم کو مذہبی حیثیت دینے کے بجائے اسے سیاسی یا سماجی قدغن قرار دیا جاتا مگر کیا کہا جائے کہ آپ کے بعض معاصرین نیز بعد کے کچھ



سادہ لوح محدثوں نے اس باریک نکتہ پر غور نہیں کیا، اور فرطِ عقیت میں اپنے تائید کے اقدام کو صحیح ثابت کرنے کے لئے نسخ کی دلیل تراشی اور اسے آنحضرتؐ کی جانب منسوب کر دیا۔ نتیجہً ان کے دلبستانِ فکر میں وہ خلفشار پیدا ہوا کہ پسنا بخدا!

فی الواقع یہ حضرات اگر وہ موقف اختیار کرتے جس کی ہم نے نشاندہی کی ہے، تو اتنی الجھنوں میں نہ پڑتے۔ صحیح مسلم کے حوالے سے جابر ابن عبد اللہ انصاری کی روایت کا تذکرہ کیا جا چکا ہے کہ:

”دورِ نبویؐ اور عہدِ ابوبکرؓ میں تو ہم ایک مٹھی کھجور اور مٹھی بھر ستودے کر متعہ کر لیا کرتے تھے۔ لیکن عمرو بن حریش کے سلسلے میں عمرؓ نے مانعت کر دی۔“

یہ بڑا واضح ثبوت ہے کہ ایک خاص واقعہ کے سلسلے میں حضرت عمرؓ نے اپنی ذاتی ناپسندیدگی کے باعث اسے ممنوع قرار دے دیا تھا۔ اور ممکن ہے کہ کوئی اس سے بھی زیادہ ناگوار معاملہ پیش ہوا ہو۔ اور آپ نے اپنی تیز مزاجی سے مجبور ہو کر مانعت کا حکم صادر کر دیا ہو۔

ورنہ متعہ کے سلسلہ میں نصِ قرآنی، سنتِ رسولؐ، عملِ صحابہؓ نیز حضراتِ ابوبکرؓ کے زمانے کا تعامل اور خود حضرت عمرؓ کے آغازِ خلافت تک متعہ کا رواج، یہ سب ایسے حقائق ہیں جو بحث و تمحیص سے بالاتر ہیں۔ تاریخ و حدیث کی کتابیں شاہد ہیں کہ عہدِ رسالتؐ میں بڑے بڑے صحابی اور خاندانِ قریش کے مشہور افراد دھڑلے سے متعہ کیا کرتے تھے اور اس قسم کے عقد سے ان کی نسل چلی بڑھی اور پروان چڑھی۔ چنانچہ سوادِ اعظم کے معتبر و مستند عالمِ راغب اصفہانی اپنی شہرہ آفاق تصنیفِ المحاضرات میں ترقیم فرماتے ہیں کہ متعہ کو حلال کہنے کے سلسلے میں ایک مرتبہ عبد اللہ ابن زبیر نے جناب عبد اللہ ابن عباسؓ کو طعنہ دیا، اس پر ابن عباسؓ نے فرمایا: ”اچھا، ذرا اپنی والدہ سے تو پوچھو، کہ ان میں اور تمہارے والد بزرگوار میں جو برابر کی آگ لگی ہوئی تھی۔“ خیریت سے وہ لگی کیسے؟

عبد اللہ ابن زبیر نے حاکمِ ماں سے پوچھا۔ بتائیے، یہ کیا قصہ ہے؟

انھوں نے صاف صاف کہہ دیا، کہ بیٹا! تم متعہ سے پیدا ہوئے ہو!



آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ عبداللہ کی والدہ جناب اسماء زوات النطاقین حضرت ابوبکر صدیق کی صاحبزادی اور اُم المؤمنین جناب عائشہ کی بہن تھیں، جنہیں صحابی رسولؐ زیرِ ابن العوام نے متعہ کے ذریعہ اپنی بیویوں سا بھی بنایا تھا۔ انکار کرنے والے، دیکھتے اب کیا فرماتے ہیں؟

اس واقعہ کے بعد راغب اصفہانی نے ایک اور روایت لکھی ہے اور وہ یہ کہ بصرہ کے کسی بزرگ نے یحییٰ ابن اکثم سے دریافت کیا کہ جواز متعہ کے سلسلہ میں جناب کس کی پیروی فرماتے ہیں؟ یحییٰ نے جواب دیا: عمر ابن الخطابؓ کی! سائل نے کہا: یہ کیسے؟ وہ تو اس معاملے میں بڑے ہی سخت گیر تھے۔ یحییٰ نے کہا: ہاں! مگر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک دفعہ برسرِ منبر اعلان فرمایا تھا کہ لوگو! اللہ اور اس کے رسولؐ نے دو متعہ حلال کئے تھے مگر میں انہیں حرام قرار دیتا ہوں۔ نیز خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دوں گا۔ لہذا ہم ان کی گواہی کو تو قابلِ قبول سمجھتے ہیں لیکن موصوف کا حکم ہمارے نزدیک لائقِ تعمیل نہیں۔

عبداللہ ابن عمرؓ کے بیان کا بھی تقریباً یہی مفہوم ہے

البتہ اس ضمن میں خلیفہ ثانی کا جو جملہ شہرت عام رکھتا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

”مُتَعَتَانِ كَانَتَا عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ وَ

أَنَا أَحَدُهُمَا“

”عہدِ رسالت میں دو متعہ تھے اور میں انہیں

حرام کرتا ہوں!“

یہاں مگر عرض ہے کہ اگر حضرت عمرؓ کی ممانعت اسی قسم کی تھی جس پر ہم روشنی ڈال چکے ہیں، تب تو معاملہ قدرِ آسان ہے ورنہ سخت مشکل!

اس منزل پر ہمیں پانچویں صدی ہجری کے محقق کامل محمد ابن ادریس حلی کا بھی ایک شہ پارہ یاد آگیا، جسے مطابقت اور توضیح مزید کے خیال سے نقل کیا جاتا ہے علامہ ممدوح جنہیں ہمارے علماءِ متقدمین میں بہت بڑا درجہ حاصل ہے۔ اپنی بلند پایہ تصنیف ”السرائر“ میں ارشاد فرماتے ہیں:-

”بکاح موقت شریعت اسلامی میں جائز

ہے اور کتابِ خدا، نیز مسلمانوں کے

مُسلل اتفاق سے از روئے سنت بھی اس



کی مشروعیت ثابت ہے۔ البتہ کچھ لوگوں نے منسوخ ہونے کا دعویٰ کیا ہے مگر اس کی درستی محتاج دلیل ہے۔ علاوہ ازیں صحیح دلائل سے یہ بات تسلیم کی جا چکی ہے کہ ہر سودمند کام جس سے حال و استقبال میں کسی نقصان کا اندیشہ نہ ہو وہ عقلی طور پر مباح ہے۔ اور نکاح متعہ میں یہ وصف موجود ہے بنا بریں عقلاً اس کے جواز کا اقرار ضروری ہے اب اگر کوئی صاحب فرمائیں کہ مستقبل میں اس کے ضرر رساں نہ ہونے کی کیا دلیل ہے جب کہ اس بارے میں مخالف آراء بھی موجود ہیں تو اس کا جواب یہ کہ باریت اس پر ہے جو امکان ضرر کا مدعی ہو۔ علاوہ ازیں مسلمانوں کا اجماع بھی اس کا واضح ثبوت ہے اور یہ حقیقت بھی روز روشن کی طرح عیاں کہ عقد متعہ آن حضرت کے زمانے میں مباح تھا، مگر بعد میں حرمت و تنبیہ کے دعوے ہونے لگے جو ثابت نہیں کئے جاسکے، اور

اباحت متفقہ طور پر ناقابل انکار، لہذا مدعیان نسخ و تحریم کی جانب سے کوئی تسلی بخش جواب ملنا چاہیے۔ اب اگر وہ ان روایات کو دہرائیں جن میں حکم امتناعی پیغمبر اکرم کی جانب منسوب ہے تو پھر انھیں یہ سننا پڑے گا کہ اس قماش کی تمام حدیثیں (بشرطیکہ صحیح بھی ہوں) اخبار آحاد ہیں جو شریعت کی دُنیا میں علم و عمل کا موجب قرار نہیں پاسکتیں اور نہ ایسی روایتوں کی بنیاد پر حقائق ثابتہ سے روگردانی جائز ہے۔

محررات کتب تذکرے کے بعد خداوندِ عالم اپنی کتاب اقدس میں ارشاد فرماتا ہے :

وَأُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَلِكَ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ ۖ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ مِنْهُنَّ فَآتُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ فَرِيضَةً ۖ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا



تَرْضَايْتُمْ بِهِ مِنْ بَعْدِ الْفَرِیضَةِ لَهُ  
آیہ وافی ہدایہ میں بحث طلب لفظ اِسْتَمْتَعْتُمْ ہے  
جس کے بس دو معنی ہیں:

(۱) انتفاع (۲) التذانی

دوسرا مفہوم لغوی ہے اور پہلا اصطلاحی، جس سے مراد  
وہ موقت اور مخصوص عقد ہے جو مقصود شرع ہے۔

اب یہاں لغوی مفہوم تو قابل اعتناء ہونے سے رہا  
کیونکہ اصول فقہ کے مطابق مسلمہ و تاعدہ یہ ہے کہ اگر  
قرآن کے کسی لفظ سے دو مطلب نکلتے ہوں، ایک لغوی او  
دوسرا وہ جسے شریعت نے رائج کیا ہو۔ تو ایسی صورت میں  
لغت پر اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ شریعت کی بات ماننا پڑے گی  
اور یہی وجہ ہے کہ لفظ صلوٰۃ، زکوٰۃ، صیام اور حج کے  
سلسلہ میں کسی فرہنگ پر نہیں بلکہ عرف شرع پر اعتماد  
کیا جاتا ہے۔

لہٰذا ان عورتوں کے علاوہ دوسری عورتیں تمھارے لئے جائز ہیں مگر شرط  
یہ کہ بدکاری نہیں بلکہ عفت اخلاق کی غرض سے زبردہ دیکر نکاح کرنا چاہو۔ ہاں جن  
عورتوں سے تم نے متعہ کیا ہوا انھیں معینہ مہر ادا کر دو۔ اور مہر کے بارے میں، اگر  
آپس میں مفاہمت کرو تو کوئی حرج نہیں۔ (النساء۔ آیت ۲۴)

نیز اس سے پہلے صراحت ہو چکی ہے کہ صحابہ تابعین  
کا ایک مشہور و معروف گروہ اباحت متعہ کا قائل تھا  
جیسے امیر المومنین علی ابن ابی طالب، عبداللہ ابن عباس  
جو اس موضوع پر ابن زبیر سے مناظرے کرتے رہے او  
ان مناظروں کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ نہ صرف زبان  
عام ہوتے بلکہ اس زمانے کے شعراء نے بھی طبع آزمائی کی  
چنانچہ ایک سخنور کہتا ہے

أَقُولُ لِلشَّيْخِ لَمَّا طَالَ مَجْلِسُهُ،  
يَا شَيْخَ هَلْ لَكَ فِي فَتَوَى ابْنِ عَبَّاسٍ

نیز عبداللہ ابن مسعود، مجاہد، عطاء، جابر ابن عبداللہ الصاری  
سلمہ ابن الاکوع، ابوسعید خدری، مغیرہ ابن شعبہ، سعید  
ابن جبیر اور ابن جریج وغیرہم یہ سب کے سب جواز کا قوی  
دیتے تھے۔ لہٰذا عقد منقطع کے خلاف جانیوالوں کا ادعا  
صحیح نہیں۔

ارباب بصیرت ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس بحث  
میں کتنی متانت و سختی اور قوت پائی جاتی ہے، خیر!  
یہاں تک تو اس موضوع پر صرف دینی اور تاریخی حیثیت



سے روشنی ڈالی گئی۔ اب آیتِ ذرا اخلاقی اور اجتماعی نقطہ نظر سے بھی جائزہ لیتے چلیں۔

اسلام دنیا کے لئے بہت بڑی نعمت ثابت ہوا۔ توحید کے وسیلے نفعِ امرت بن کر برے جن سے غم نصیب انسانیت کو بے پایاں سکون حاصل ہوا جس طرح یہ بانی ہوئی بات ہے اسی طرح اس حقیقت کا اعتراف بھی لازم کہ دینِ نبی ہر زمانے کا ساتھ دیتا ہے۔ ہر وقت کے تقاضے پورے کرتا ہے نیز عالم بشری کی جملہ ضروریات دنیوی و اخروی کا تکفیل اور ہر گونہ فلاح و بہبود کا ضامن ہے۔ آئینِ رحمت میں رحمت کا سوال ہی نہیں۔ آنکھوں کو کھلیجے ٹھنڈک! ایک دنیا کیا تمام عالموں کے لئے برکت۔ اسی لئے تو یہ کامل ترین مذہب اور آخری شریعت بننے کا حقدار ٹھہرا۔ کون نہیں جانتا کہ قانونِ الہی نے انسانی معاشرے کو ایسا سنوارا کہ کسی اور دستور کی حاجت نہ رہی۔

اتنا جاننے کے بعد اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا افرادِ انسانی کو کبھی سفر کی ضرورت پیش نہیں آتی؟ نفی میں جواب ممکن نہیں، کیونکہ مشاہدہ بتلاتا ہے کہ لوگ عموماً سفر کرتے ہیں۔ بلکہ غائر نگاہ سے دیکھا جائے

تو معلوم ہوگا کہ جب سے انسان نے ہوش سنبھالا اور اپنے شعور سے کام لینا شروع کیا، اُس وقت سے اس نے اپنی معاش کے لئے جو وسیلے اختیار کئے ان میں سفر کو خاصی اہمیت حاصل ہے مختلف ضرورتیں آدمی کو راہِ غربت طے کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ مثلاً تجارت، ملازمت تحصیل علم یا جنگ اور دفاع وغیرہ اور یہ بھی مسلم کہ مذکورہ اغراض کے سلسلہ میں نوجوان یا کم از کم توانا افراد ہی دُور دراز ملکوں کا عزم کر سکتے ہیں۔

اور کسے معلوم نہیں کہ اس حکیم مطلق نے بقائے نسل اور حفظِ نوع کے لئے ہیکلِ انسانی میں جنسی خواہش بھی ودیعت فرمائی ہے، اور یہ بھی ظاہر کہ ایک مسافر آدمی عقدِ دائم کے تقاضے پورے کرنے سے قاصر ہوتا ہے نیز نوڈلیوں، باندیوں کی فراہمی بھی آسان نہیں (آج کل تو ناممکن ہے) لہذا ان حالات میں اس مدت کے بچھڑے ہوئے پر دیسی کو کیا کرنا چاہیے۔ جو اتفاق سے نوعِ مجبور بھی بس دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ ضبطِ نفس، یا بدکاری۔

۱۔ مگر ضبطِ نفس میں نہ صرف مہلک قسم کی مختلف بیماریاں پیدا ہونے کا خطرہ رہتا ہے بلکہ نسل کا منقطع ہو جانا



بھی کچھ بعید نہیں اور یہ منافی حکمت ہے۔ شریعتِ اسلامی بڑی آسان اور آرام دہ شریعت ہے۔

”سہولت چاہیے ہے شدت نہیں مقصود“

دین میں کسی پہلو تکلیف نہیں! (قرآن)

۲۔ جنسی بے راہ روی سے خدا محفوظ رکھے۔ آج دنیا کے بیشتر حصے اس کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ سچی بات یہ ہے اگر مسلمان صحیح طریقہ سے شرعی قوانین پر عمل پیرا ہو جائیں تو حسب وعدہ خداوندی یہ کائنات ان کے لئے سراپا رحمت بن جائے اور اچھے دین پھر واپس آجائیں۔

متعہ بھی دین اسلام کا ایک سودمند قانون ہے اگر مسلمان اس کے شرائط کا لحاظ کرتے ہوئے یعنی عقدِ عدہ اور محافظتِ نسل پر نظر رکھ کر عمل پیرا ہوتے تو بڑی حد تک بدکاریوں کا انسداد ہو جاتا۔ عزتیں محفوظ رہتیں، حلال نسلیں بڑھتیں، دنیا ناجائز بچوں سے نجات پاتی اور اخلاقی قدروں کو فروغ حاصل ہوتا۔

رئیس ملت حضرت عبداللہ ابن عباس کے اس جاودانی قول کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں:

”متعہ ایک رحمت تھا، جس سے خداوندِ عالم نے اُمتِ محمدیہ کو نوازا تھا۔ اور اگر اس سے منع نہ کیا جاتا تو سوائے گئے گزرے لوگوں کے اور کوئی زنا کا مرتکب نہ ہوتا“

(ملاحظہ ہو نہایہ ابن اثیر اور الفائق زمخشری)

ابن عباس کے اس پُر مغز بیان میں ان کے جلیل القدر استاد اور مرقی حکیم الہی امیر المومنین علیہ السلام کی تعلیم کے اثرات جھلک رہے ہیں اور حقیقت یہ کہ عالمِ اسلامی نے اس نیکی سے منہ موڑ کر اپنی بد نصیبی کا سامنا کیا ہے۔

وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ

## ★ طلاق

گزشتہ مباحث سے واضح ہو گیا ہو گا کہ تزویج کی حقیقت وہ خاص ربط ہے جو مرد اور عورت کے درمیان قائم ہوتا ہے، اور دو مختلف افراد کو ایک دوسرے کا قرین اور کفو بنادیتا ہے۔ عائلی نظام میں زن و شوہر کے توافق و اشتراک کو دونوں آنکھوں اور ہاتھوں سے



تشبیہ دینا چاہیے۔ ایک دوسرے کے ساتھی، ایک دوسرے کے ساجھی۔

یہ امر اپنی جگہ کس قدر لائق توجہ ہے کہ وہ دو ہستیاں جو آپس میں بالکل غیر ہوتی ہیں عقدِ زواج "انہیں اس مضبوطی سے ملا دیتا ہے، اس شدت سے ان میں اتحاد پیدا کرتا ہے کہ اس سے زیادہ متحکم علاقہ یگانگت کا تصور ناممکن ہے بلکہ اس خصوصی وابستگی اور اس کے گہرے اثرات کو ظاہر کرنے کے لئے کلامِ الہی کی اس آیت کے علاوہ اور کوئی مناسب و موزوں عبارت سمجھ میں نہیں آتی۔

هٰنَ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لِّهِنَّ

"وہ تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو!"

واقعہ یہ ہے کہ اس آیہ وافی ہدایہ میں اس قدر معجزانہ محاسن اور محیر العقول نکات پنہاں ہیں، جن کے اعتراف سے قلم قاصر ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اس رشتہ کا قدرتی تقاضہ یہ ہونا چاہیے کہ مرتے دم تک نہ ٹوٹے بلکہ مرنے کے بعد بھی قائم رہے مگر یہ کہ کوئی ایسی مشکل نکل آئے جس کے باعث مشترکہ

زندگی بسر کرنے کا مذکورہ معاہدہ ختم ہو جائے۔

بسا اوقات کچھ ایسے ناگزیر حالات واقعات اور ضرورتیں پیش آجاتی ہیں جن کی وجہ سے اس گروہ کا کھولنا لازم ہو جاتا ہے چنانچہ اس کی چند صورتیں ہیں:-

- (۱) علیحدگی کی خواہش دونوں طرف سے ہو۔
- (۲) ایک ہی فریق معاہدہ توڑنے پر اصرار کرے۔

شریعت نے ہر موقع کے لئے ایسے قواعد مقرر کئے ہیں جن کی رو سے جدائی ممکن ہو جاتی ہے۔

مثلاً اگر نفرت و کراہت کا اظہار شوہر کی جانب سے ہو تو اسے طلاق کا اختیار ہے۔ اور اگر ناپسندیدگی زوجہ کی طرف سے ہو تو وہ خلع حاصل کر سکتی ہے۔ نیز اگر ناراضماندی میں دونوں شریک ہوں تو پھر ضابطہ مبارک کی سمت رجوع ہونا پڑے گا۔

ان میں سے ہر ایک کے لئے کچھ احکام بعض شرطیں اور خاص مواقع ہیں جن کا اعتبار واجب ہے۔

اسلام چونکہ ایک اجتماعی دین ہے اور اس کی عمارت وحدت و یکتائی کی بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہے۔ اس مذہب کا سب سے بڑا مقصد محبت و اتفاق ہے۔ اس لئے اس



کی حدوں میں انتشار اور تفرقہ کو انتہائی مذموم سمجھا جاتا ہے۔

بنابریں اکثر روایات میں طلاق کی کراہت کا ذکر موجود ہے اور بعض احادیث میں وارد ہوا ہے کہ "حلال خدا میں طلاق سے زیادہ کوئی ناپسندیدہ چیز نہیں!"

اسی واسطے شارع مقدس نے طلاق کے سلسلہ میں کچھ شرطیں لگا دیں اور بعض قیود عائد کر دیئے تاکہ اس نوع کے حادثے کم سے کم تعداد میں وقوع پذیر ہوں۔

چنانچہ اصحابِ مذہب کے احکام طلاق میں شادی، عدلین کا ہونا شرط لازم ہے۔ اگر دو عادل گواہوں کے بغیر طلاق دی جائے گی تو وہ باطل متصور ہوگی۔

یہ شرط باہمی نفرت کو ختم کرنے کا بہترین وسیلہ ہے کیونکہ نیک اور عادل نفوس کو معاشرہ میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اور ان کی شخصیت عام دلوں پر خاصا اثر کرتی ہے نیز گواہ جب اچھے صفات کے حامل ہوں گے تو غلط نصیحت اور صلح و صفائی کی جانب توجہ دینا اپنا فرض سمجھیں گے۔ ہاں!

یہ ضروری نہیں کہ ہر موقع پر ان کی کوششیں بار آور ہو جائیں لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ اس طریقہ سے فارغ خطی کے واقعات میں کافی کمی واقع ہو سکتی ہے۔

مگر افسوس کہ برادرانِ اہل سنت نے اس سلسلہ پر دھیان نہیں دیا، اور انہوں نے طلاق کے لئے شاہدین، عدلین کی موجودگی کو لازم نہیں قرار دیا۔ نتیجہ ان کے ہاں طلاق کا دائرہ اتنا پھیلا کہ سخت مشکل آن پڑی۔

شریعت کے مقدس اور بلند مقاصد نیز اس کے تمدنی اسرار و رموز سے تقریباً سب ہی غافل ہیں، کاش مسلمان پوری تندرہی کے ساتھ احکام ربانی پر عمل پیرا ہو سکیں تاکہ کم از کم ان کی عائلی زندگی میں جو تلخیاں پیدا ہو گئی ہیں، اور خانگی نظم و انضام میں جو ابتری پھیلی ہوئی ہے اس کا ارتقاع ہو جائے۔

دوسری بڑی شرط یہ ہے کہ طلاق دہندہ مجبور، مشتعل اور بے حواس نہ ہو۔ نیز طلاق پانے والی..... پاک ہو۔ اس طہ میں اس سے احتلاط نہ کیا گیا ہو۔

فقہ جعفری میں طلاق ثلاث "ایک ہی طلاق تسلیم کی جاتی ہے۔"



لہذا اگر کوئی شخص ایک ہی نشست میں اپنی بیوی کو تین مرتبہ طلاق دے دے تو وہ ہمیشہ کے لئے اس پر حرام نہیں ہوتی۔ بغیر محلل کے اس کا رجوع کر لینا جائز ہے البتہ اگر رجوع کے بعد پھر طلاق ہو جائے اس کے بعد پھر رجوع اور پھر طلاق تو تیسری بار وہ حرام ہو جائے گی، اور پھر اُس وقت تک حلال نہیں ہو سکتی جب تک کہ کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے۔ نیز اگر دوبارہ ہی عمل جاری ہے تو نویں مرتبہ حرام مؤبد ہو جائے گی۔ یعنی اپنے پہلے خاوند کے لئے ہمیشہ کے لئے ناجائز قرار پائے گی۔

سوادِ اعظم کے بیشتر علماء نے طلاق ثلاث کے ضمن میں اختلاف فرمایا ہے۔ ان حضرات کے نقطہ نظر سے کسی شوہر کا اپنی زوجہ سے یہ کہہ دینا کہ میں نے تجھ کو تین

مرتبہ طلاق دی " طلاق بائن ہے جس میں بغیر محلل کے دوبارہ حلال ہونا ممکن نہیں۔ حالانکہ ان کے صحاح میں یہ صراحت موجود ہے کہ طلاق ثلاث " طلاق واحد ہی کے مانند ہے۔ جیسا کہ بخاری میں جناب ابن عباس کی سند سے مذکور ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ :

" عہد رسالت، دور ابو بکر اور حضرت عمر کی خلافت کے دو سال تک طلاق ثلاث طلاق واحد شمار ہوتی تھی۔ مگر حضرت عمر نے کہا کہ جس معاملہ میں انتظار چاہیے تھا، لوگوں نے اس میں جلد بازی شروع کر دی۔ پس اگر ہم اسے نافذ کر دیں، چنانچہ یہ رواج پا گیا۔"

اور خود قرآن مجید و اشکاف لفظوں میں اعلان کر رہا ہے :  
الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ فَاِمْسَاكٌ اَوْ تَسْرِيْحٌ اِلٰلْحَاثِ  
("طلاق (رجعی) دو مرتبہ ہے۔ اس کے بعد یا توقعہ کے مطابق روک لینا چاہیے، اور یا پھر اچھے برے تانوں کے ساتھ زحمت کر دیا جائے۔"

(البقرہ آیت : ۲۲۹)

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے :

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ اَبَعْدِ حَتّٰى تَنْكِحَ ذَوْجًا غَيْرَہَا  
"پس اگر تیسری دفعہ بھی طلاق (بائن) دے دے تو پھر جب تک دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے اس کے لئے حلال نہیں ہو سکتی۔"

(البقرہ آیت : ۲۳۰)



اسباب طلاق کی یہ ایک اجمالی بحث تھی تفصیل فقہی کتابوں میں موجود ہے۔

علاوہ ازیں جُدائی کے کچھ اور وجوہ بھی ہیں مثلاً وہ عیوب و امراض جو موجب فسخ ہوتے ہیں جیسے جنون، جذام اور عورتوں میں رتق و قرن کے عوارض نیز ظہار و ایلا بھی شراق پیدا کرتے ہیں۔

عدہ کے اقسام، وطی شبہ اور ملک بمین کی متعلقہ تفصیل بھی مبسوط ذخیروں میں نظر آئے گی۔

شوہر کے مرنے پر بیوی کے لئے مطلق طور پر عدہ واجب ہے خواہ وہ یا انسہ صغیرہ اور غیر مدخولہ ہی کیوں نہ ہو لیکن طلاق میں ان تینوں صورتوں کے علاوہ واجب ہے۔ البتہ ناجائز ہم بستری (زنا) میں عدہ نہیں۔

عدہ وفات کی مدت چار مہینے دس دن ہے اور حمل کی شکل میں البعد الاجلین کا لحاظ کرنا پڑے گا یعنی وضع حمل یا عدہ وفات میں جو مدت زیادہ ہو اس کی پابندی لازم ہے۔ عدہ طلاق کی میعاد تین پاکیزگیاں یا تین ماہ کا عرصہ حاملہ کے لئے وضع حمل اور کنیز کے واسطے آزاد عورت کی نصف مدت مقرر ہے۔

طلاق اگر تین مرتبہ نہیں واقع ہوئی ہے اور خلع کی صورت بھی نہیں ہے تو عدہ کے دوران میں شوہر رجوع کر سکتا ہے مگر عدہ کا زمانہ گزارنے کے بعد عورت کو اختیار حاصل ہے، اور اس شکل میں دوبارہ نکاح کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

ہمارے ہاں رجوع کے سلسلے میں دو گواہوں کی موجودگی ضروری نہیں سمجھی جاتی، جیسا کہ طلاق میں اسے لازم قرار دیا گیا ہے لیکن مستحب ہے، نیز اس کے لئے خاص الفاظ استعمال کرنے کی بھی کوئی حاجت نہیں، بلکہ ایسے الفاظ و اشارات ہی کافی ہیں جن سے منشاء پورا ہو جائے۔

## خلع و مبارات!

علاقہ زوجیت اُس وقت تک منقطع نہیں ہو سکتا جب تک دونوں فریق یا دونوں میں سے کوئی ایک ناپسندیدگی کا اظہار نہ کریں عموماً یہی جُدائی کی علت ہوتی ہے۔

پس اگر نفقہ صرف شوہر کی طرف سے ہے تو اس کے اختیار میں طلاق ہے، جس کے ذریعے اگر وہ چاہے تو چھٹکارہ حاصل کر سکتا ہے، اور اگر زوجہ کراہت کرتی ہے تو اس کیلئے



یہ قاعدہ ہے کہ وہ بطور فدیہ کچھ مال دے کر خواہ وہ زمرہ ہی کے برابر کیوں نہ ہو یا اس سے زیادہ کچھ ایصال کئے مقررہ صیغہ جاری ہونے کے بعد آزاد ہو سکتی۔ اسے خلع کہتے ہیں۔ اس میں بھی طلاق کی تمام شرطوں کا التزام ہے اور مزید برآں یہ کہ مظاہرہ نفرت عورت ہی کی طرف سے ہو اور وہ بھی پوری شدت کے ساتھ۔

جیسا کہ کلام باری میں ارشاد ہوتا ہے :

فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَعْتَدُوهَا "پس اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ یہ دونوں حدودِ خداوندی کو برقرار نہیں رکھ سکیں گے تو اگر عورت مرد کو کچھ دیکر چھٹکارا (خلع) حاصل کر لے، تو اس میں دونوں کے لئے کوئی حرج نہیں۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں، جن سے تجاوز نہیں کرنا چاہیئے۔" (البقرہ۔ آیت: ۲۲۹)

اس آیت کے ذیل میں اہل بیت کی تفسیر یہ ہے کہ زوجہ اپنے شوہر سے یہ کہنے لگ جاتے کہ میں تیری قسم کا اعتبار نہیں کروں گی۔ تیرے بارے میں اللہ کے مقرر کئے ہوئے قانون کی پابندی نہیں کروں گی۔ ہم بستری کے لئے تیار نہیں ہوں گی،

اور تیرے گھر میں ناپسندیدہ عناصر کو جگہ دوں گی! ظاہر ہے کہ اس سے انتہائی نفرت کا اعلان ہوتا ہے اور بلا لپک کوئی امکان نہیں نظر آتا۔

لیکن اگر منافرت میں دونوں یکساں ہوں تو یہ مبارات کی شکل ہوگی، اس میں بھی طلاق کی تمام شرطوں کا پابند ہونا ضروری ہے۔ اس موقع پر شوہر کو زوجہ سے دیئے ہوئے زمرہ سے زائد مال لینے کا حق نہیں۔

خلع و مبارات میں طلاق بائن ہوتی ہے، جس میں شوہر کو رجوع کرنے کا اختیار نہیں رہتا۔ البتہ فدیہ کے بعد عورت کو یہ حق پہنچتا ہے، ایسی صورت میں مرد چاہے تو قاعدہ کے مطابق عدہ کے دوران رجوع کر سکتا ہے۔

## ظہار۔ ایلام۔ لعان!

یہ اسباب بھی فی الجملہ تحریم کا باعث ہیں مگر اپنی خاص شرطوں کے ساتھ جو فقہ کی کتب ابوں میں لکھی ہوئی ہیں۔ چونکہ ایسے حادثے کم ظہور پذیر ہوتے ہیں، بنا بریں یہاں ان سے بحث کرنا غیر ضروری ہے۔



## وراثت!

ایک مالک کے فوت ہونے سے دوسرے کے نام اس کے متروکہ اموال کے منتقل ہونے کو اس نسب یا سببی رشتہ کے باعث جو ان دونوں میں موجود ہو وراثت کہتے ہیں۔

زندہ قرابت دار وراثت — متوفی مورث — اور استحقاق — ارث — کہلاتا ہے۔ ایک شخص کا دوسرے سے یاد و نون کا تیسرے سے متولد ہونا سبب ہے۔

اگر کسی وارث کا حق کتاب الہی میں معین ہے تو وہ اس زمرے میں شمار ہوگا جو باعتبار مندرجہ ورثہ پاتے ہیں۔ ورنہ وہ قرابت کے لحاظ سے ورثہ دار ہوگا۔ قرآن مجید میں منصوص حصے چھ ہیں حصص اور حقت داروں کی تشریح حسب ذیل ہے:

• نصف (½) — شوہر — بشرطیکہ زوجہ کا کوئی لڑکا نہ ہو

اکلوقی لڑکی اور بہن!

• ربع (¼) — شوہر — جب زوجہ کا لڑکا موجود ہو۔

ب — زوجہ — بشرطیکہ شوہر کا فرزند نہ ہو۔

• ثمن (۱/۳) بیوی — لڑکے کی موجودگی میں۔

• ثلث (⅓) ماں — لڑکے اور مورث کے بھائیوں کے

نہ ہونے کی صورت میں، نیز کلالہ

مادری کے متعدد افراد۔

• دو ثلث (⅔) — دو یا دو سے زیادہ لڑکیاں اور بہنوں کا

بھی یہی حکم ہے، بشرطیکہ کوئی لڑکا نہ ہو۔

• سہ (⅓) ماں باپ میں سے ہر ایک — لڑکے کی موجودگی

میں، نیز کلالہ مادری کا ایک مشرذ خواہ مرد

ہو یا عورت۔

اور جو اس جدول (چارٹ) میں نہیں آتے ہیں وہ

قرابت داری کی وجہ سے وارث ہوں گے۔

عورت کے مقابلے میں مرد کا حصہ دو گنا ہے۔

نسبی وارثوں کے تین طبقے ہیں:

۱۔ ماں، باپ، اولاد نیچے تک۔

۲۔ اجداد اور پر تک، بھائی نیچے تک۔

۳۔ چچا، پھوپھی، ماموں اور خالہ جو سب اولوالارحام

ہیں۔ ان میں کوئی بھی صاحب فرض نہیں، اس سلسلے میں کلی

قاعدہ یہ ہے کہ قریب کی موجودگی میں بعید قطعاً وارث



نہیں ہو سکتا۔ یعنی نزدیکی و تراتب دار کے ہوتے ہوئے دُور کے رشتہ دار کو ورثہ نہیں ملے گا۔

فرقہ شیعہ اور اہل سنت کے درمیان سوائے عول و تعصیب کے باقی مسائل وراثت میں چنداں اختلاف نہیں۔ امامیہ فقہ میں اہل بیت اطہار کے طریقوں سے تواتر کے ساتھ یہ ثابت ہے کہ وراثت میں نہ عول ہے نہ تعصیب۔ اور یہی اعظم صحابہ کا بھی مسلک تھا۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس مشہور و معروف بیان کو سنداً پیش کیا جاسکتا ہے جس میں آپ نے عول و تعصیب کی نفی فرمائی ہے۔ اس کے علاوہ بھی کافی دلائل موجود ہیں۔ جنہو متوفی کے فرزند اکبر کا حصہ ہے۔ اس میں مورث کے کپڑے، تلوار، قرآن اور انگشتری شامل ہے۔

زوجہ کو اراضی مزروعہ وغیرہ مزروعہ پر کوئی حق نہیں، اسی طرح جائیداد غیر منقولہ میں سے اسے عمارتوں، اور درختوں کی صرف قیمت (بقدر حصہ) ادا ہوگی۔ اصل پر قبضہ نہیں دیا جائے گا۔ ان دو مسائل میں شیعہ منفرد ہیں، اور آئمہ معصومین کے اقوال سے ان نظریات کی تائید ہوتی ہے۔

## وقف ہبہ اور صدقات

وہ مال جو کسی کی ملکیت ہو اور پھر اسے وہ اپنے تصرف سے نکالنا چاہے تو یا تو یہ اخراج مطلق حیثیت سے ہوگا، یعنی۔! جائیداد نہ صرف یہ کہ صاحب جائیداد کے قبضہ سے خارج ہو جائے بلکہ قطعی طور پر ہر شخص کے لئے ناقابل ملکیت بن جائے، جیسے غلام کو آزادی بخش دی یا کسی مکان و زمین کو ملکیت سے جدا کر کے عبادت گاہ، مسجد یا زیارت گاہ بنادیا۔ اس نوعیت کے اقدام سے کوئی جائیداد کبھی کسی سبب اور وجہ سے کسی کی بھی دوبارہ ملکیت میں نہیں آسکتی۔

دوسری شکل یہ کہ ملکیت سے الگ ہونے میں صرف یہ پہلو ملحوظ رکھا جائے کہ وہ ایک مالک کے تصرف سے نکل کر دوسرے کے قبضہ میں چلی جائے۔ اب یہ عمل یا تو کسی مالی معاہدے کے تحت یا مفاہمت کی بنیاد پر ہوگا۔ جیسے خرید و فروخت، بیع و فاء اور صلح وغیرہ اور یا پھر اس میں مالی معاوضہ کا کوئی تصور نہیں ہوگا، دوسری شکل میں اگر مقصد اجر و ثواب و لذت ہے تو عام مفہوم میں اسے صدقہ کہیں گے نیز اگر مال اس قسم کا ہے کہ قابل لحاظ مدت تک رہ سکے،



اور صدقہ دینے والے کی نیت بھی یہی ہو کہ مال زہے اور نفع امور خیر میں کام آئے تو یہ وقف کہلائے گا لیکن اگر مال رہنے کے قابل نہیں اور خیرات دہندہ نے اس کی بقار کی شرط بھی نہیں لگائی ہے تو اسے خاص مفہوم میں صدقہ کا نام دیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں اگر کسی شخص کو کسی اثاثے یا جائیداد کا مالک قرار دینے میں اجر و ثواب مقصود نہ ہو تو اسے ہبہ کہتے ہیں۔ لیکن اگر اس بخشش کے مقابلے میں کوئی معاوضہ طلب کر لیا جائے تو یہ ہبہ عوض کی شکل ہوگی۔ جیسے کوئی آدمی دوسرے سے کہے کہ "میں تمہیں یہ کرتا ہبہ کرتا ہوں تم مجھے یہ کتاب ہبہ کر دو" پس اگر طرف مقابل قبول کر لے تو لزوم عائد ہو جائے گا، اور فریقین میں سے کوئی بھی اپنا مال دوبارہ لینے کا مجاز نہیں مگر یہ کہ دونوں دوبارہ قول و قرار فسخ کرنے پر رضامند ہو جائیں۔ ہبہ کی تمام صورتوں میں قبضہ شرط ہے۔

ہبہ جائزہ میں یعنی جس میں کوئی معاوضہ نہ حاصل کیا گیا ہو دی ہوئی چیز کا واپس لینا صحیح ہے۔ البتہ دی ہوئی چیز کا قرابت داروں (ذوی الارحام) شوہر یا زوجہ سے مانگنا جائز ہے۔

نہیں۔ اسی طرح تلف شدہ مال کی واپسی کا مطالبہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔

قبضہ کے بعد صدقات کا واپس لینا بھی درست نہیں بلکہ اگر قبضہ نہ بھی ہو جب بھی ان کی بازیافت جائز نہیں قرار دی جاسکتی۔

صیغہ وقف جاری کرنے کے بعد جب جائیداد متولی یا جن کے لئے وقف کی گئی ہے، ان کے قبضہ میں فے دی جائے نیز اگر خود واقف بھی تولیت کے ارادہ سے وقف کر دے جائیداد متصرف ہو جائے تب بھی اسے دوبارہ واپس لینے، بیچنے، رہن رکھنے یا تقسیم کرنے کا حق نہیں رہتا۔ خواہ یہ وقف علی الاولاد ہی کیوں نہ ہو، جسے وقف خاص سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یا وقف عام ہو، جیسے غریبوں، ناداروں اور مساجد و مدارس کے نام موقوفہ جائیداد۔

البتہ چند خاص مواقع ایسے ہیں جہاں استثنائی صورت پیدا ہو سکتی ہے اور وقف شدہ جائیداد کو فسخ و خت کیا جاسکتا ہے، مثلاً

• وقف کا خراب ہو جانا، مگر خرابی کی وہ منزل جس میں اصل سے کوئی فائدہ نہ ہوتا ہو۔!



• برباد ہونے کا شدید اندیشہ جس میں نفع کی صورت ختم ہوتی نظر آرہی ہو۔

• قابضوں کا ایسا اختلاف جس سے جان و مال اور عزت و آبرو کو گزند پہنچنے کا خطرہ لاحق ہو جائے۔

مگر ان تمام حالات کے باوجود کسی شخص کو خود بیچنے یا حصے بخرے کرنے کا حق نہیں پہنچتا، بلکہ فیصلہ کا دار و مدار حاکم شرع پر ہوگا۔ حاکم شریعت ہی کو اختیار ہے کہ وہ جملہ کوائف کا جائزہ لیکر مناسب حکم صادر کرے۔

لیکن افسوس کہ اوقات کے سلسلہ میں لوگ انتہائی مساوات میں پڑ گئے ہیں۔ حدود شریعت کا خیال نہیں رہا۔ اور مقررہ ضابطوں کی پروا نہیں کی جارہی ہے۔ بہت حال خداوندِ عالم سب کے عزم و عمل سے آگاہ ہے وہو اللطیف الخبیر یہ وقف کا مختصر سا بیان تھا۔ جسے شہرتِ عام حاصل ہے۔

## مقدمات کے فیصلے!

عمدہ قضا اور نظامتِ عدل و انصاف کو بڑی اہمیت حاصل ہے، اور ہے بھی یہ انتہائی معزز رتبہ

امامیہ مذہب میں عدلیہ کی ذمہ داری کو نبوت، امامت اور ریاستِ عامہ کا ایک شعبہ تصور کیا جاتا ہے پروردگارِ عالم ارشاد فرماتا ہے:

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُم بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ ۖ اے داؤد، ہم نے تمہیں زمین پر خلیفہ بنایا ہے۔ لہذا تم حق و انصاف کے ساتھ لوگوں کے فیصلے کیا کرو۔

دوسرا فرمان ہے:

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ۖ "تم ہے تمہارے رب کی (اے رسول!) جب تک یہ لوگ آپ کے ججگروں میں بغیر کسی تنگ دلی کے تم کو حکم نہیں بنائیں گے، اور پوری طرح تمہارے فیصلے کو تسلیم نہیں کر لیں گے اُس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے۔"

قاضی اور حاکم نوامیس ثلاثہ یعنی جان، مال اور عزت



کے خدائی امانت دار ہوتے ہیں، اسی لئے اس عہد میں قدم قدم پر سخت خط کے لاحق رہتے ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں حدیثوں کے مضمون پر غور کیا جائے تو کمال عظمت کو دیکھ کر پہاڑ بھی ہیچ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

”قاضی کو جہنم کے کنارے پر سمجھنا چاہیے فیصلہ دینے والے کی زبان دو انگاروں کے بیچ میں ہوتی ہے۔ اے شریع! تم ایسی جگہ بیٹھے ہو جہاں نبی بیٹھتا ہے۔ یا اس کا وصی اور یا پھر کوئی شفیق“

حدیث نبوی میں وارد ہوا ہے۔ ”جسے قاضی بنا دیا گیا، آگوا بغیر چھری کے ذبح کر دیا گیا“ اس قبیل کی اور بہت سی روایتیں ہیں۔

فقہ جن حکم کو دلائل سے مستنبط کرتا ہے، اگر وہ کسی کلمی موضوع سے متعلق ہے تو اسے فتویٰ کہیں گے، جیسے بغیر اجازت کے دوسروں کے مال میں تصرف جائز نہیں۔ شوہر کے لئے اس کی بیوی حلال ہے اور غیر مرد کے واسطے حرام! لیکن اگر حکم کسی جزئی موضوع کے بارے

میں ہے تو اسے فیصلے اور قضا کا نام دیا جائے گا، جیسے یہ زوجہ ہے وہ اجنبیہ ہے۔ یہ زید کا مال ہے۔ وہ فلاں کی جائیداد ہے۔

فتویٰ ہو یا فیصلہ، یہ دونوں مجتہد عادل، اور امام علیہ السلام کے نائب عام کے خصوصی فرائض ہیں فیصلہ (قضا) جو فی الحقیقت کسی موضوع کی تشخیص ہوتا ہے، یہ خواہ مرافعہ اور مقدمہ کے ساتھ ہو یا اس کے بغیر جیسے روٹی ہلال اور وقت و نسب وغیرہ کے متعلق صدور حکم۔ بہر کیف اس کے لئے غیر معمولی عقل و فہم اور ذکاوت و ذہانت درکار ہے۔ بلکہ فتویٰ فیصلہ سے زیادہ مشکل کام ہے۔

اب اگر کوئی ایسا شخص اس کام کو انجام دینے لگے، جس میں ان صفات کا فقدان ہو تو یقینی طور پر فائدے سے زیادہ نقصان پہنچے گا۔ بنا بریں امامیت، مذہب میں مجتہد عادل کے سوا کسی اور شخص کے لئے اس کام کی انجام دہی ناجائز قرار دی گئی ہے، بلکہ اسے گناہان کبیرہ میں شمار کیا جاتا ہے، جس کی حدیں کفر سے جا ملتی ہیں۔



ہمارے اساتذہ کرام اور اعظم علمائے شیعہ حکم نافذ کرنے میں انتہائی احتیاط برتتے تھے چنانچہ ہمارا بھی یہی شعار ہے۔

فیصلہ کا دار و مدار تین بنیادی امور پر ہوتا ہے۔  
(۱) اقرار (۲) بئینہ (۳) قسم۔ بئینہ سے مراد دو عادل گواہ ہیں۔

اختلاف و تعارض کے موقعوں پر تقدیم و ترجیح سے کیونکر فائدہ اٹھایا جائے یہ قانون شہادت کی تفصیل طلب شقیں ہیں جن کی تصریح کا موقعہ نہیں۔ اس عنوان پر ہمارے فقہار کی متقبل تصانیف موجود ہیں۔ اس عنوان پر ہم اپنی کتاب "تحریر المجملہ" کی چوتھی جلد میں بھی خاصی روشنی ڈال چکے ہیں۔ حاکم جامع الشرائط کے حکم کو رد کرنے والا احکام خداوندی کو رد کرنے والا متصور ہوگا۔ نیز جامع الشرائط حاکم کے فیصلہ پر کسی دوسرے کو نظر ثانی کرنے کا حق نہیں البتہ وہ خود اپنے فیصلہ کا مکرر جائزہ لے سکتا ہے۔

## ذبح و شکار!

امامیہ کے نزدیک شریعت کا اساسی قاعدہ تو

یہ ہے کہ جانوروں کا کھانا مطلق طور پر ناجائز ہے (یعنی کچھ شرطوں کے ساتھ جائز ہوتا ہے) اور خون جہندہ رکھنے والے حیوانات موت سے نجس ہو جاتے ہیں۔ نیز جانوروں کی دو قسمیں ہیں نجس العین، طاہر العین۔

نجس العین وہ جانور ہیں جن کی طہارت ناممکن اور بہر صورت ان کا کھانا حرام ہو۔ جیسے کتا اور سور۔ دوسری قسم کے حیوانات اگر بغیر شرعی تذکیہ کے مر جائیں تو وہ بھی نجس العین ہوں گے اور ان کا استعمال بھی مطلقاً حرام ہوگا۔ خواہ پرند ہوں۔ یا چرند جنگلی ہوں، یا پالتو۔ اور خون جہندہ رکھتے ہوں یا نہ۔ لیکن اگر تذکیہ شرعی سے مرے ہیں تو مطلق طور پر طاہر العین ہوں گے۔

دندے اور وحوش ناجائز ہیں۔ اگرچہ وہ پاک ہی کیوں نہ ہوں۔  
خون جہندہ رکھنے والے حیوانات کے تذکیہ کے دو طریقے ہیں:

(۱) شکار۔ اس میں بھی حلال کرنے کی دو صورتیں ہیں:  
(۱) اُس سدھائے ہوئے کتے کے ذریعہ شکار کیا جائے جو حکم ماننا ہو اور اپنا شکار کھانے کا عادی نہ ہو، اس



میں یہ بھی شرط ہے کہ کتے کو شکار پر چھوڑنے والا، مسلمان ہو۔ اور چھوڑتے وقت اس نے اللہ کا نام لیا ہو نیز شکاری کی نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔

(۲) تیراندازی کے وسیلے شکار حاصل کیا جائے اس میں تلوار، نیزہ بلکہ تمام آلات جارحہ اور لوہے کے جملہ نوک دار ہتھیار شامل ہیں۔ بندوق کی گولی بھی (آہنی ہو یا کسی اور دھات کی) ان ہی میں شمار ہوگی۔

مگر شرط یہ کہ اس قسم کے حربے استعمال کرے والا مسلمان ہو اور ہتھیار چلاتے وقت اس نے اللہ کا نام لیا ہو اگر سدھائے ہوئے کتے یا تیر و تفنگ سے شکار کا کام تمام ہو جائے تو اس کا کھانا جائز ہے۔ لیکن اگر صیاد اپنے صید کو زندہ پالے تو اس کا تذکیہ کرنا چاہیے علاوہ ازیں دوسرے وسائل جیسے چیتے یا رسی کے پھتکے سے کیا ہوا شکار ناجائز ہے۔ البتہ اگر زندہ ہاتھ آجائے تو تذکیہ کے بعد جائز ہوگا۔

(ب) شرعی ذبیحہ : اس کے لئے ہمارے ہاں پہلی شرط یہ ہے کہ ذبح کرنے والا مسلمان یا مسلمانوں کے حکم میں ہو (جیسے کسی مسلمان کا لڑکا، یا کسی مسلمان کا ملا ہوا

بچہ) دوسری شرط یہ کہ امکان میں ہوتے ہوئے لوہے کے ہتھیار سے حلال کیا جاتے۔ مگر ضرورت کے وقت ہر اس چیز کا استعمال صحیح ہوگا جس سے معینہ رگیں کٹ جائیں۔ اللہ کا نام لینا بھی شرط ہے۔ قبلہ رخ ہونا بھی ضروری ہے۔ نیز "اوداج اربعہ" یعنی شہ رگوں اور زخروں کا کٹنا لازمی ہے۔ البتہ اونٹ کے لئے ذبح کی جگہ نحس کافی ہے، اور باقی حیوانات کے سلسلہ میں اگر ذبح ناممکن ہو تو نحر کرنا جائز ہوگا، ان کے علاوہ وہ حیوان جن میں خون جہندہ نہیں ہوتا، وہ سب حرام ہیں جیسے دریائی جانور کہ ان میں سوائے چھلکے والی مچھلی کے اور کوئی جائز نہیں۔ مچھلی اگر پانی کے باہر مرتے تو اس کا تذکیہ ہو جاتا ہے۔

اس موقع پر ہمیں ایک پُر لطف واقعہ یاد آگیا۔ محمد ابن نعمان احول جنہیں "مومن طاق" کے نام سے شہرت حاصل ہے بیان فرماتے ہیں کہ۔ ایک دفعہ میں ابو حنیفہ کے پاس گیا، دیکھتا کیا ہوں کہ آپ کے آگے کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ اور جب ان کی مجھ پر نظر پڑی تو کہنے لگے۔ یہ کتابیں دیکھ رہے ہو؟ میں نے کہا۔ "جی ہاں! سامنے ہیں!"۔ فرمائیے لگے۔ "تمام کی تمام"



طلاق کے موضوع پر ہیں! میں نے کہا۔ اس سلسلے میں  
کلام الہی کی ایک ہی آیت نے ہمیں آپ کی ان تمام  
کتابوں سے بے نیاز کر دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے :  
يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَطَلِّقُوهُنَّ  
لِحَدِّتِهِنَّ وَاحْضُوا الْعِدَّةَ ۚ لہ

اے رسول! جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دو تو  
ان کی عدت کے ہنگام دو۔ اور عدت کا حساب رکھو۔  
یہ سن کر آپ کہنے لگے۔ اچھا تم نے اپنے دوست (امام  
جعفر صادقؑ) سے کبھی یہ بھی پوچھا کہ دریائی گائے کے  
متعلق ان کی کیا رائے ہے، اس کا کھانا جائز ہے یا ناجائز؟  
مومن طاق بیان کرتے ہیں۔ میں نے کہا۔ جی ہاں! حضرت  
کا ارشاد ہے :

” ہر چھلکوں والی چیز، خواہ وہ اونٹ ہو، یا  
گائے کھائی جاسکتی ہے۔ اور جس کے چھلکے  
نہ ہوں، اس کا کھانا حرام ہے۔“

## خورد و نوش!

حیوانات کی تین قسمیں ہیں: زمینی۔ آبی۔ ہوائی۔  
یہ ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ آبی جانوروں میں سوائے  
چھلکوں والی مچھلی کے اور کوئی چیز حلال نہیں۔ مچھلی  
کے انڈے بھی مچھلی ہی کے حکم میں ہیں۔  
زمینی حیوانات میں پالتو مویشی، جنگلی گائیں، پہاڑی  
مینڈھے، نیز ہرن اور بارہ سنگے جائز ہیں۔  
گھوڑے۔ نچر اور گدھے مکروہ ہیں۔ نجاست کھانے  
والے جانور حرام ہیں۔ لیکن استبرار کے بعد کھائے جاسکتے  
ہیں۔

دُزدوں کی تمام قسمیں حرام ہیں۔ خرگوش۔ لومڑی۔ بچو  
اور نیولے وغیرہ یہ سب ناجائز ہیں۔ کیڑے مکوڑے، جیسے  
لال بیگ۔ کیچوے۔ سانپ۔ بچھو مطلقاً حرام ہیں۔

پرنڈوں میں دُزدگی کی صفت رکھنے والے طائر جیسے شکرے  
باز، بھری وغیرہ کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔ علاوہ ان



شارع مقدس نے حلال پرندوں کی پہچان کے لئے تین حالات میں تین علامتیں قرار دی ہیں :

• طائر اگر فضا میں ہو تو اس کے پروں میں سکون سے زیادہ حرکت ہونا چاہیئے۔

• زمین پر ہو تو اس کے پر میں خار کا ہونا ضروری ہے۔ ذبح شدہ حالت میں اگر پوٹا ہے تو وہ حلال ہوگا ورنہ حرام سمجھنا چاہیئے۔

چمگاڈر، مور، بھڑیں اور ماکھی یہ سب ناجائز ہیں۔ وہ کوا جو نباتات کھاتا ہو جائز ہے، اور مردار کھانے والا حرام ہے۔

حیوانات کے علاوہ ناجائز خورد و نوش کو چار کلیات میں منضبط کیا جاسکتا ہے :

۱۔ ہر غصب شدہ چیز کا استعمال حرام ہے۔

۲۔ ہر نجس شئی حرام ہے۔

۳۔ ہر مضر حرام ہے۔

۴۔ ہر خبیث حرام ہے۔

۵۔ یہ کوا ہمارے ملک میں نہیں ہوتا :

سیال اشیا میں سب سے زیادہ شدید حرمت پیشاب کی ہے، اور اس سے بڑھ کر شراب ہے! نیز خمر، نبید، فقاع، عصیر (شراب کے جملہ اقسام) اہامیہ مذہب میں مسکرات کی حرمت و نجاست کے سلسلہ میں تمام اسلامی فرقوں سے زیادہ سخت احکام ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں آئمہ طاہرین علیہم السلام سے جو روایتیں ملتی ہیں ان کے مضامین دیکھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کشید کرنے والے، ذخیرہ اندوز، فروخت کنندہ اور منہ نوش ان تمام پر نفرین کی گئی ہے۔ ہماری شریعت میں اسے "ام الخبائث" کہا جاتا ہے۔ اہل بیت کی بعض حدیثوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس میز پر بیٹھنا بھی حرام ہے جس پر مسکرات کو جگہ دی گئی ہو۔ غالباً اس میں راز یہ ہے کہ لوگ شدت کے ساتھ ناجائز مشروبات سے پرہیز کریں۔ تاکہ خورد و نوش کی دوسری اشیا میں ان کی بوباس اور اثرات سہرایت نہ کرنے پائیں۔ علوم جدیدہ کے ماہروں نے کیمیائی تجزیے کے بعد اعتراف کیا ہے کہ شراب بُری بلا ہے نہایت مضر، حد درجہ ہلاکت آفرین!



اسلکھرنے تیرہ سو سال پہلے ہی اس حقیقت سے  
آگاہ کر دیا تھا، چنانچہ آج وہ لوگ بھی اس سے کنارہ کش ہو  
رہے ہیں، جن کی شریعت اسے حرام قرار نہیں دیتی! شرع  
محمدیؐ کی کیا تعریف ہو سکتی ہے! جو لوگ اس کی پابندی  
نہیں کرتے، وہ خود کو تباہی میں ڈالتے ہیں۔

حُدُود اور عزیمت





### ☆ حُرُود! —

نظام اجتماعی کی حفاظت اور پہلیت انسانی کی صیانت  
کے لئے چند خاص جرائم کی یہ فوری سنزائیں ہیں۔

### ☆ حُرُونا! —

ہر وہ بالغ و عاقل جو جانتے بوجھتے ہوئے کسی نابالغ  
عورت کے ساتھ جنسی اختلاط کرے گا، تو صاحبِ اختیار  
حاکم پر واجب ہوگا کہ اسے سو کوڑے لگائے۔ نیز  
اس کا سر منڈوا کر ایک سال کے لئے شہر بدر کر دے۔

اگرچہ ہر نے تیرہ سو سال پہلے ہی اس حقیقت سے  
گواہ کر دیا تھا، چنانچہ آج وہ لوگ بھی اس سے گناہ کش ہو  
رہے ہیں جن کی شریعت اسے تراز نہیں دیتی اور شرع  
مندی کی کیا اہمیت ہو سکتی ہے اور جو اس کی پابندی  
نہیں کرتے، وہ خود کو تباہی میں ڈالتے ہیں۔

\* المیزان \* ۱۴۰۵ھ



اور اگر زنا سے محصنہ کا مرتکب ہوا ہے تو سنگسار کیا جائیگا پھر اگر عورت بھی راضی ہو تو شوہر دار ہونے کی صورت میں اس کو بھی یہی سزا ملے گی۔ ورنہ صرف سو کوڑے لگائے جائیں گے۔

اگر کسی شخص نے اپنی محرماتِ نسبی، رضاعی یا سوتیلی ماں کے ساتھ ناجائز فعل کا ارتکاب کیا ہو یا کوئی ذمتی کسی مسلمان خاتون سے زنا کرے، تو اسے قتل کیا جائے گا، زنا بالجبر کی بھی یہی سزا ہے۔

زنا کے ثبوت کے لئے مجرم کا چار مرتبہ اقبال کرنا یا چار عادل گواہوں کی شہادت ضروری ہے۔ تین مرد اور دو عورتیں بھی کافی ہیں۔ اور اگر دو مردوں اور چار عورتوں نے گواہی دی ہے۔ تو صرف سو کوڑے لگیں گے سنگسار نہیں کیا جائے گا۔ اس سے کم میں زنا کا ثبوت مکمل نہیں سمجھا جاسکتا۔ نیز اگر دو یا تین آدمیوں نے شہادت دی تو انھیں قذف (تہمت) کی سزا دی جائے گی۔ گواہوں کی گواہی میں کامل اتفاق اور مشاہدہ شرط ہے۔

مجرم اگر سنگساری کے بموجب اقرار کر کے انکار کر جائے تو وہ حد ساقط ہو جائے گی، اور اگر اقرار کے بعد توبہ کر لے

تو حاکم کو اختیار ہے۔ نیز گواہیوں کے بعد توبہ کرنے سے حد ساقط نہیں ہوگی۔

دو دفعہ کا سزا یافتہ مجرم اگر تیسری مرتبہ ارتکاب جرم کرے گا تو اسے قتل کی سزا دی جائے گی۔ حاملہ پر وضع حمل تک، اور بیمار پر صحت مند ہونے تک حد جاری نہیں کی جاسکتی۔

### ★ لواط اور سحی کی سزائیں! —

کسی جرم و گناہ کی اتنی سزا نہیں جتنی اس معصیت کے لئے قرار دی گئی ہے سوائے اس مقام کے اور کسی جگہ آگ سے جلانے کی اجازت نہیں! خلاف "وضع فطری" عمل کرنے والے کے لئے حاکم وقت مفصلہ ذیل سزائوں میں سے کوئی بھی سزا تجویز کر سکتا ہے۔

قتل، سنگساری، بلندی سے گر کر ہڈیاں پھوٹ کر دینا آگ میں جلانا، مفعول اگر بالغ و بااختیار ہے تو اسے قتل کی سزا دی جائے گی اور کم سن کے لئے تعزیری کارروائی ہوگی۔ لواطت کے ثبوت کے لئے بھی یہی شرطیں ہیں، جو زنا

میں معتبر ہیں۔ اسی طرح سحی میں فاعلہ اور مفعولہ دونوں پر



سوسو کوڑوں کی حد جاری ہوگی، نیز شوہر دار ہونے کی صورت میں سنگساری کی سزا بھی بعید نہیں۔ دلاؤں کے لئے پچھتر کوڑے مقرر ہیں۔ علاوہ ازیں سرمنڈوا کر شہر بدر بھی کیا جاگا۔ ثبوت کے لئے دو عادل گواہوں کی شہادت یا دو مرتبہ اقرار کرنا کافی ہے۔

## ★ تہمت کی سزا —

اگر کوئی شخص کسی عاقل و بالغ اور آزاد مسلمان پر کوئی ایسا الزام عائد کرے جس پر حد جاری ہو سکتی ہے۔ مثلاً زنا لواط اور شراب نوشی کی تہمت، تو اس جرم کی پاداش میں اُسے اسی کوڑوں کی سزا دی جائے گی۔ قابل قبول ثبوت یا جس پر تہمت لگائی گئی ہے اس کی تصدیق سے حد ساقط ہو جائے گی۔ دو عادل گواہوں کی شہادت سے جرم صحیح سمجھا جائے گا۔ ناپسندیدہ خطاب مثلاً کسی کو فاسق قاجر جذامی یا برصی کہنا بھی قابل تعزیر ہے۔ نیز وہ شخص جو نبوت کا دعویٰ کر بیٹھے یا چہارہ معصومین میں سے کسی پر سب و شتم کرے تو اسے قتل کی سزا دی جائے گی۔

## ★ مسکری سزا —

مے نوش یا عہدِ مدیم و جدید کی کوئی نشہ آور چیز استعمال کرنے والے کی حد ۸۰ کوڑے ہیں، جو ننگی پیٹھ اور شانے پر لگائے جائیں گے۔

تین دفعہ کا سزا یافتہ اگر چوتھی مرتبہ مرتکب جرم ہوگا تو قتل کیا جائے گا۔ شراب کو حلال سمجھنے والے کی بھی یہی سزا ہے۔ شراب بیچنے والا اگر اپنے پیشے سے تائب ہو جائے تو فیہما، ورنہ وہ بھی سزائے قتل کا مستحق ہوگا۔

## ★ چوری کی سزا —

بالغ و عاقل شخص اگر کسی بند چیز کی چوری کرے جس کی قیمت ۱۰ مثقال خالص سونے کے مساوی ہو تو عدالت میں پیش ہوگا، اور دو مرتبہ اقرار یا بدینہ کے بعد اس کے سیدھے ہاتھ کی چار انگلیاں قطع کی جائیں گی، اور اگر وہ دوبارہ اس جرم کا مرتکب ہوا تو پھر قدم کے نیچے سے اس کا بایاں پاؤں کاٹا جائے گا۔ تیسری دفعہ جس دواہم کی سزا دی جائیگی نیز اگر وہ زنداں میں بھی سرقہ کرے گا تو پھر قتل ہوگا۔



جاری ہونے سے پہلے اگر اس نے کئی بار چوری کے جرم کا ارتکاب کیا ہے تو اس پر ایک ہی حد جاری ہوگی۔ بچے او مجنون کے لئے حد نہیں متعزیر ہے۔ چور کو مطلق طور پر تاوان دینا پڑے گا۔ تاوان کے سلسلے میں ایک مرتبہ اقبال اور ایک عادل گواہ کی شہادت قسم کے ساتھ کافی ہے۔ بیٹے کا مال چرانے پر باپ کے ہاتھ نہیں کاٹے جائیں گے لیکن برعکس اس کے بیٹے کے ہاتھ قطع ہوں گے۔

### ★ محارب کی سزا! —

شہر، صحرا یا دریا میں لوگوں کو ڈرانے، دھمکانے یا لوٹ مار کے ارادے سے ہتھیار دکھانے والے کو حاکم شرع حسب صواب دیدقتل پھانسی، ہاتھ کاٹنے، پیر قطع کرنے یا شہر بدری کی سزا دے سکتا ہے۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّ مَا جَزَاؤُا الَّذِيْنَ يُحَادِّثُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ وَا  
يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُقْتَلُوْا اَوْ  
يُصَلَّبُوْا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ  
خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ

جو لوگ خدا اور رسول خدا سے جنگ کرتے ہیں دنیا میں فساد پھیلانے کی سعی کرتے ہیں، ان کی سزا یہ ہے کہ یا تو انہیں قتل کیا جائے یا پھانسی دی جائے یا ہاتھ پیر کاٹے جائیں اور یا پھر شہر بدر کر دیا جائے۔ لہ شہر بدری کی صورت میں مجرم کو جس علاقہ میں پابند کیا جائے، وہاں کے باشندوں کو تحریراً مطلع کر دینا چاہیئے تاکہ لوگ اس کے ساتھ ترک موالات (سوشل بائیکاٹ) کریں یہاں تک کہ وہ تائب ہو جائے۔

گھبر پر حملہ کرنے والا چور (ڈاکو) بھی محارب ہے یہ اگر قتل ہو جائے تو اس کا خون رائیگاں تصور ہوگا۔ اگر کوئی شخص کسی خاتون کی عزت یا بچے پر حملہ کرے تو انہیں حفاظت خود اختیاری کا حق حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں اگر حملہ آور مرنے لے تو اس کا خون بھی رائیگاں جائے گا۔ ٹھگت، نوٹرباز اور چھوٹے گواہ لائق تعزیر ہیں، حاکم مناسب سزا تجویز کر سکتا ہے۔



## ★ مختلف سزائیں!

کسی چوپائے کے ساتھ بد فعلی کرنیوالا واجب التعمیر ہے۔ باز نہ آنے کی صورت میں مستوجب قتل ہوگا۔ ایسا چوپایہ جن کا گوشت کھایا جاتا ہو، بد فعلی سے اس کا گوشت حرام ہو جائے گا۔ بلکہ اس کی نسل کا گوشت بھی ناجائز ہوگا۔ اس کیلئے حکم یہ ہے کہ جانور کو ذبح کر کے جلا دیا جائے اور مالک کو قیمت دلوا دی جائے مثلاً تہہ جانور کو تہہ اندازی کے ذریعہ نکالنا چاہیے۔ لیکن جن حیوانات کا گوشت ناقابل خوردنی ہو، انھیں دوسرے شہر میں بھرت کر کے ان کی قیمت تصدق کر دینا چاہیے۔ مال اگر مجرم کا نہیں ہے تو جس کا نقصان ہوا ہے، اس کے نقصان کی تلافی ضروری ہے۔ دو عادل گواہوں کی شہادت یا دو مرتبہ اقرار کرنے سے جرم ثابت ہو جائے گا۔

میت کے ساتھ جنسی بے راہ روی اختیار کرنے والے کے لئے وہی حکم ہے جو زندہ کے لئے ہے۔ بلکہ یہاں عقوبت زیادہ شدید ہو جاتی ہے۔ بیوی اور مملوکہ کھے

صورت میں مناسب سزا دی جائے گی۔ اس کے ثبوت کیلئے بھی وہی شرائط ہیں جو زنا اور نواحطت کے ہیں۔

استمناء بالید (جلق) کرنیوالا بھی لائق تعزیر ہے۔ ہر شخص ممکن طریقہ سے اپنی، اپنے مال، جائیداد اور متعلقین کے لئے مدافعت کر سکتا ہے، لیکن پہلے آسان اور پھر تدریجاً سخت ذرائع اختیار کرے۔

کسی کے گھر میں بھانکنے والے کو اگر گھر والوں نے سنگ و حشت کا نشانہ بنا دیا، اور اس ضرب سے اس کا کام تمام ہو گیا۔ تو اس کا خون رائیگاں سمجھا جائے گا۔

## ★ قصاص اور دیت

قتل ناحق۔ سب سے بڑا گناہ اور عظیم ترین فساد ہے۔ جان بوجھ کر کسی مومن کو ہلاک کرنے کی سزا جہنم ہے جس سے کبھی چھٹکارا نصیب نہیں ہو سکتا۔

”وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا“ ۱

جرم خواہ اس حد تک ہو کہ کوئی جان تلف ہو جائے



یا اس قدر کہ انسان کے جسم کا کوئی جز و ضائع ہو جائے  
بہر حال مجرم! مجرم ہے۔

قتل کی تین صورتیں ہیں:

قتل عمد — شبیہ عمد — خطائے محض!

قتل عمد کسی وضاحت کا محتاج نہیں شبیہ عمد کا  
یہ مطلب ہے کہ مجرم نے کوئی اقدام تو کیا ہو۔ مگر قتل کی  
نیت نہ رکھتا ہو مثلاً کسی کوتاہ دیکھا زور کو بک کی جائے  
اور وہ اس صدمہ سے مر جائے یا کسی مریض کو کوئی دوا  
پلا دی جائے اور وہ اس کا کام تمام کر دے۔

خطائے محض کا یہ مفہوم ہے کہ مقتول سے متعلق نہ  
ارادہ ہو نہ اقدام اور نہ خون ہو جائے، جیسے کوئی شخص کسی  
پرنده کو نشانہ بنا رہا ہو مگر غلطی سے انسان ہدف بن جائے  
یا کوئی آدمی اپنی بندوق اٹھا رہا ہو، اور وہ چھوٹ کر  
کسی کو ہلاک کر دے۔

اس کی زیادہ واضح قسمیں سوئے ہوئے آدمی۔ خیال  
شخص، پاگل اور نا سمجھ بچے کے افعال ہیں۔

ان تمام انواع میں براہ راست۔ بالواسطہ اقدام، اور  
انفرادی و اشتراک یکساں حکم رکھتے ہیں۔ قصاص کا تعلق صرف

قتل عمد سے ہے۔ شبیہ عمد اور قتل خطا میں دیت ادا  
کرنا پڑتی ہے۔ قصاص کے لئے مجرم کا بالغ و عاقل ہونا  
شرط ہے۔ بچہ اور مجنون قابل قصاص نہیں ہیں مقتول کیلئے بھی  
عقل و بلوغ ضروری ہے۔ چنانچہ اگر کوئی بالغ کسی نابالغ کا  
خون کر دے تو اس کے لئے قصاص کے بجائے دیت ہے۔  
بعض قصاص کے بھی قائل ہیں۔ یہی کیفیت مجنون کی ہے۔  
جزوی نقصان میں اختیار معتبر ہے۔ مگر ہلاکت نفس  
میں جبر و اکراہ کا کوئی اعتبار نہیں۔ کیونکہ خون کے معاملے  
میں تقیہ ناجائز ہے۔ مقتول کا معصوم النفس ہونا بھی  
ضروری ہے۔ یعنی ایسا شخص نہ ہو جسے قتل کرنے کی شریعت  
نے اجازت دی ہو۔

مجرم رشتہ میں مقتول کا باپ دادا یا پردادا بھی نہ ہو  
کیونکہ آبا و اجداد سے بیٹے یا پوتے کے قتل کے سلسلہ میں قصاص  
نہیں لیا جاسکتا۔ بلکہ انھیں صرف دیت ادا کرنا پڑے گی مسلمان  
صرف مسلمان کے خون کی وجہ سے مستوجب قصاص ہوگا، اسی  
طرح آزاد سے صرف آزاد کا قصاص لیا جائے گا۔

آزاد مسلمان کا خون بہا یہ ہے۔ سو اونٹ یا دو سو گائیاں  
یا ایک ہزار بھیڑیں یا دو سو حملے، یا پھر ایک ہزار دینار،



جو پانچ سو تر کی پاؤنڈ کے مساوی ہوتے ہیں۔

اگر مقتول کے وارث دیت لینے پر راضی ہو جائیں تو قصاص ساقط ہو جائے گا، اور قاتل کو ایک سال کے اندر اندر دیت ادا کر دینا پڑے گی۔

● شبیہ عمد میں، خون بہا کی ادائیگی کے لئے دو سال کی مدت رکھی گئی ہے۔

● قتل خطا میں تین سال کی مدت ہے اور ہر سال ایک تہائی واجب الادا ہوگی۔

جزوی نقصانات، جیسے ہاتھ پیر کاٹ ڈالنا، یا آنکھ پھوڑ دینا وغیرہ۔ اس میں عمداً اقدام کرنے کا قصاص آنکھ کے بدلے آنکھ کان کے بدلے کان، اور دانت کے بدلے دانت ہے۔

خطا اور شبیہ عمد میں ہر عضو کے بدلے یا پوری دیت ادا کرنا پڑے گی یا نصف، یا نصف سے کم۔

اعضائے مفرد (طاق) جیسے ناک وغیرہ کی دیت پوری ہے اور جفت مثلاً آنکھیں ہاتھ۔ پیر ان میں سے ہر ایک کی نصف

اور دونوں کی پوری دیت قابل ایصال ہوگی۔ شبیہ عمد میں دیت کا ذمہ دار خود مجرم ہے، اور خطائے محض میں متعلقین

کو ادا کرنا چاہیے۔ تفصیل کے لئے فقہ کی مبسوط کتابیں موجود

ہیں۔ چونکہ ہم انتہائی اختصار سے کام لے رہے ہیں اس لئے بہت سے ابواب کا تذکرہ نہیں کر سکے۔ پھر ہمارا مقصد بھی صرف یہ تھا کہ کچھ جھلکیاں دکھا دی جائیں۔ اور اشاروں اشاروں میں بات ختم ہو جائے۔

اس کتاب میں جو کچھ بیان ہوا ہے اسے امامیہ عقائد و مسلمات کے صرف عنادین کی حیثیت حاصل ہے۔ شرح و بسط کے لئے ان اوراق میں گنجائش کہاں ہے؟

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لئے

اب فرمائیں علمائے دین اور عامۃ المسلمین کہ ہم نے جو حقائق پیش کئے ہیں ان میں سے کوئی بھی چیز ایسی تھی جسے اسلام کی بربادی کا سبب کہا جائے؟ یا یہ کہ کوئی بھی ایسا مسئلہ ہے جو یہودیت، نصرانیت، مجوسیت اور زرتشتیت سے ماخوذ ہو؟ یا ان مباحث میں کوئی ایسا پہلو نظر آتا ہے جو دین توحید کے بنیادی نظریات اور کتاب و سنت کے مخالف معلوم ہوتا ہو؟

خدا را انصاف کرو، اور بہتان تراشیوں سے باز آؤ۔



آخر میں ہماری دُعا ہے کہ برادرانِ اسلام شکوک و شبہات  
کی دُنیا سے نکل کر قرآن کے پرچم کے سایہ میں ایک نظر آئیں، اور  
اپنی عظمتِ رفتہ کو دوبارہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوں۔  
یہ ظاہر ہے کہ جب تک فرقہ وارانہ جھگڑوں کا خاتمہ  
نہیں ہوگا، اُس وقت تک عزت کی سحر نمود نہیں کر سکتی  
اللہ ہمیں باہمی رواداری کی توفیق عطا کرے، اور محبت کے  
رشتوں کو استحکام حاصل ہو ۛ

خاتمہ



## مسئلہ بدار

اس مسئلہ کے ضمن میں بھی شیعوں کو بہت مطعون کیا جاتا ہے۔ غلط حاشیہ آرائی کرنے والے نظریہ بدار کو منسوخ کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ شیعوں کے عقیدے میں خداوندِ عالم ایسے کام کر بیٹھتا ہے، جن کا اسے علم نہیں ہوتا۔ (معاذ اللہ) اس سے بڑھ کر اور کیا جہالت ہو سکتی ہے؟ یہ تو کفر صریح ہے، کیونکہ اس سے ایک طرف تو ایزدِ متعال کی صفتِ علم کا انکار لازم آتا ہے، اور دوسری جانب وہ محلِ حوادث اور آماجگاہِ تغیرات قرار پاتا ہے جس سے شانِ وجوب کی نفی ہوتی ہے۔ امامیہ فرقہ ان واہی تو اہی خیالات کی قطعاً نفی کرتا ہے، بلکہ کوئی اسلامی فرقہ بھی اس گمراہ کن فکر کے حق میں نہیں۔ البتہ تجسیمِ اقیان رکھنے والے بعض عناصر کی طرف ان خرافات کی نسبت دی جاتی ہے، چنانچہ خدا کے بارے میں یہ ان ہی میں سے کسی کا قول ہے

آخر میں ہماری دعا ہے کہ برادرانِ اسلام شکوک و شبہات کی لوند سے نکل کر قرآن کے پرچم کے شاہیہ میں ایک نظر آئیں اور اپنی عقیدتِ رقتِ کورد و بارہِ حاصل کی سبب سے کامیاب ہوں۔ یہ ظاہر ہے کہ جب تک فرقہ وارانہ فکروں کا فائدہ نہیں ہوگا، اس وقت تک کہ حرکت کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ اللہ چاہے تاہی لڑاؤ جاری کی توفیق عطا کرے اور ہر دشمن کو اپنا کام حاصل ہو۔

شکوک



اعفونی عن الفرج واللحیة واسئلونی عما شئتم  
 بس دارھی اور شرم گاہ کے بارے میں مجھے معاف  
 رکھو، اور باقی جو چاہو، پوچھ لو۔

صحیح نظریہ بدار جس کے مشیعہ قابل ہیں وہ تو آل محمد  
 کے اسرار و رموز میں شامل ہے چنانچہ اہل بیت کے  
 حدیثوں میں وارد ہوا ہے کہ :

انہ ما عبد الله بشیء مثل القول بالبداء و  
 انہ ما عرف الله حق معرفته من لم يعرفه بالبداء  
 " اقرار بدار سے جس طرح فرض بندگی ادا ہوتا ہے  
 اس طرح کسی اور چیز سے نہیں ہوتا جس نے بدار  
 کو دلیل عرفان نہیں بنایا۔ اسے اللہ کی پوری معرفت  
 نہیں حاصل ہوئی۔ "

اس مضمون کی اور بھی روایتیں ہیں بحقیقت یہ کہ علم کی دو قسمیں  
 ہیں۔ ایک وہ جس سے قدرت نے اپنے ملائکہ و رسل کو مالا مال  
 کیا ہے، اس دانش و آگہی کے مطابق یقینی طور پر وہی ہوگا  
 جو انہیں بتایا گیا ہے مگر دوسری قسم وہ ہے جس سے نہ کوئی  
 مقرب بارگاہ فرشتہ واقف ہوتا ہے اور نہ کوئی برگزیدہ نبی !،  
 بس وہی جانتا ہے۔ چنانچہ اس کے مطابق وہ تقدیم و تاخیر اور

محو اثبات جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یہ علم کی وہ منزل ہے جسے  
 باری تعالیٰ نے اتم الکتاب سے تعبیر فرمایا ہے۔ یٰٰہُوا اللّٰهُ مَا  
 یَشَاءُ وَیُثَبِّتُ ۖ وَعِنْدَکَ اُمُّ الْکِتَابِ ۝ اس سے معبود برحق  
 کی قدرت کاملہ، حکمت بالغہ اور اس کے مختار مطلق اور  
 فَعَالٌ لِّمَا یُرِیدُ ۝ ہونے کا اظہار ہوتا ہے۔

یہ مسئلہ یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ جو حیثیت فسخ کو  
 تشریع میں حاصل ہے وہی کیفیت تکوین میں بدار کی ہے  
 پس جس طرح تشریعی ضابطوں کی ترمیم، اضافے اور تغیر و  
 تبدل میں اس کی نامعلوم مصلحتیں کار فرما ہوتی ہیں۔ اسی طرح  
 تکوینی امور میں انخفاء و ابدار کا تعلق ان اسرار و رموز سے ہے  
 جن کے فہم و ادراک سے ہماری عقلیں قاصر ہیں۔

بدار کا ایک یہ عنوان بھی ہے کہ خاصان خدا کو ایک  
 بات کا علم ہوتا ہے۔ مگر اس کے شرائط و موانع کی اطلاع  
 نہیں ہوتی۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کو یہ تو معلوم تھا کہ دو لہا شب  
 زفاف مہر جائے گا، مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ واقعہ کے ظہور  
 پذیر ہونے کے لئے صدقہ نہ دینا شرط ہے۔ چنانچہ اتفاقاً  
 دو لہا کی ماں نے خیرات دے دی اور وہ بچ گیا۔ جب حقیقت



مسیح کے سامنے پیش ہوئی تو آپ نے فرمایا، تم لوگوں نے اس کی طرف سے کچھ تصدق کرو یا ہوگا۔ صدقہ تمام بلاؤں کو رد کرتا ہے۔

اس قسم کے اور نظائر بھی ہیں، ان مواقف کا فائدہ یہ ہے کہ ایک تو نفوس انسانی کی آزمائش ہو جاتی ہے، اور دوسری یہ کہ خوتے تسلیم پروان چڑھتی رہتی ہے۔ ذبح اسماعیل کے سوال پر جناب ابراہیم کا امتحان اس کی واضح دلیل ہے۔ نیز اگر بداد نہ ہو تو دُعا و تصدق، شفاعت و توسل اور انبیاء و اولیاء کی گمریہ وزاری، نیز کمال اطاعت کے باوجود ان کے خوف و ہراس کا کوئی مطلب نہیں رہتا۔ ہاں! ان ذواتِ مقدسہ کے لرزاں و ترساں ہونے کا سبب وہ علمِ مکنون و مخزون ہے جس سے کوئی آگاہ نہیں اور یہی بداد کا سرچشمہ ہے۔

بداد کے اقسام قصار و قدر اور لوحِ محو و اثبات کی تفصیل مقصود ہو تو ہماری کتاب الدین والاسلام کی پہلی جلد کا مطالعہ مفید رہوگا۔ اس مجموعہ میں ہم نے شرح و بسط کے ساتھ ان مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔

## ★ تقیہ!

تقیہ کے معاملے میں بھی شیعوں کو خوب خوب بدنام کیا جاتا ہے، لیکن یہ بھی صفتِ اس وجہ سے کہ عام اہل اسلام اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ اگر نگاہِ غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ شیعہ حضرات جس تقیہ کے قائل ہیں وہ صرف ان ہی سے مختص نہیں۔ بلکہ یہ ایک عقلی ضرورت اور فطری تقاضہ ہے۔

شریعتِ اسلامی کا کوئی حکم ایسا نہیں جس میں عقل و دانش کا توافق نہ دکھائی دے۔ ہر مسئلہ میں علم و خرد ساتھ ساتھ نظر آئیں گے۔

جبلتِ بشری کا جائزہ لیجئے تو اقرار کرنا پڑے گا کہ ہر انسان اپنی جان کا بچاؤ کرتا ہے۔ جان بڑی پیاری ہوتی ہے البتہ اگر عزت و وقار پر آنچ آنے لگے یا حفاظتِ حق کا معاملہ درمیان ہو تو پھر حد درجہ عزیز ہونے کے باوجود ہستی کی کوئی ہستی نہیں رہتی! لیکن اگر یہ امور نہ ہوں تو پھر کون ہٹو نہ ہوگا، جو جان جو کھوں میں ڈال کر جگ ہنسائی کروانے کے لئے



تیار ہو؟ اس کے علاوہ بے ضرورت تہلکہ میں پڑنا عقل و شرع دونوں کے خلاف ہے۔

اسی لئے شارع مقدس نے اجازت دی ہے کہ وہ مسلمان جو خطروں میں گھرا ہوا ہو، اور اس کی جان یا ناموس کو گزند پہنچنے کا اندیشہ لاحق ہو وہ باطناً عمل کرتے ہوئے ظاہر بظاہر انھما سے حق سے کام لے سکتا ہے۔

کلام الہی میں:

إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاتُوهُ وَإِلَّا مِّنْ أَكْثَرِ وَ قَلْبُهُ مُطْمَئِنٌّ بِالْإِيمَانِ ۖ لَهُ سَيِّئٌ مَّقْصُودٌ ۖ تَارِيخِ اسلام میں جناب عمار، ان کے والدین، نیز بعض دیگر اصحاب کے واقعات موجود ہیں کہ کافروں کے ظلم سے مجبور ہو کر وہ اظہار کفر کر بیٹھے۔

تقیہ پر عمل کرنے کے تین احکام ہیں:

- (۱) بے مقصد جان جا رہی ہو تو واجب ہے۔
- (۲) اگر اظہار حق مفید مقصد ہو تو عمل اور ترک عمل میں اختیار ہے۔

لہ سورة آل عمران - آیت : ۲۸

لہ سورة نحل - آیت : ۱۰۶

(۳) لیکن اگر باطل کو قوت پہنچے، اُمت گمراہ ہونے لگے اور جو روستہم میں شدت پیدا ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر تقیہ حرام ہے۔

آئیے! اب ہم اس کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہیں تاکہ ہم باضمیر انسان کو یہ فیصلہ کرنے میں آسانی ہو کہ تقیہ پر عمل پیرا ہونے کے سلسلے میں غریب شیعہ قابل ملامت ہیں (بشرطیکہ یہ عمل قابل ملامت ہو) یا وہ عناصر جنہوں نے ان کی آزادیاں چھین کر تقیہ کے لئے مجبور کر دیا۔

امید و معاویہ نے غلبہ حاصل کرتے ہی شریعت کو کھلونا بنالیا تھا، اور ہاتھ دھو کر شیعہ ان علیؑ کے پیچھے پڑ گئے تھے شیعہوں کا خون پانی سے زیادہ سستا تھا۔

مروانی حکومت بھی اسی غلط سیاست پر کار بند رہی۔ اس کے بعد عباسیوں کا دور آیا۔ انھوں نے مشق ستم میں اور تیزی پیدا کر دی۔ نتیجتاً مہتان اہل بیت کو مختلف موقف اختیار کرنا پڑے۔ کبھی چھپے، کبھی ابھرے۔ گاہ ضرور نے انہیں مخفی رہنے پر مجبور کیا۔ اور کبھی حمایت حق کے جوش میں کفن باندھ کر نکل کھڑے ہوئے تاکہ ان کے خون کی دھاریں نشان مندرل کا کام دیتی رہیں۔



چنانچہ بہت سے شہیدِ اعظم نے تقیہ کی ضرورت محسوس نہیں کی اور دنیا نے ظلم کا مقابلہ کر کے خلعتِ شہادت زیب تن کیا۔ شہدائے مرجعِ عذرا کی داستانِ خاصہ شہرت رکھتی ہے۔ یہ چودہ جاں باز تھے جنہوں نے رسولِ مقبول کے مثالی عبادت گزار صحابی حجر بن عدی کندی کی قیادت میں اپنی جانیں جانِ آفریں کے سپرد کر دیں۔

حجر ابن عدی فتحِ شام کے نامور فوجی رہنما بھی تھے، امیر معاویہ کے الفاظ ہیں — ”مرجعِ عذرا میں“ میں نے جن لوگوں کو تہ تیغ کیا ہے، ان میں سے ہر ایک کے متعلق بتا سکتا ہوں کہ اس میں کیا فی“ تھی، اور کیوں قتل ہوا؟ مگر حجر کے بارے میں لا جواب ہونا پڑتا ہے کہ آخر میں انہیں کس جرم میں شہید کیا؟

ہاں! ہم بتاتے ہیں کہ حجر کا کیا قصور تھا؟ اس شہید نے تقیہ کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اور صرف اس لئے کہ آلِ اُمیہ کا ستم عالمِ آشکارا ہو جائے۔ اور دنیا کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اس گھرانے کو دین سے کتنا تعلق تھا!

نیز صحابی جلیل عمرو ابن حمق خزاعی اور عبدالرحمن ابن حسان لے مرجعِ عذرا شام کے ایک قریہ کا نام ہے۔

نوری کا واقعہ کسے نہیں یاد، ابن زیاد نے انہیں زندہ دفن کرا دیا تھا۔ میثم تمار۔ رشید ہجری اور عبداللہ ابن یقطر کو دارِ پر، کھینچوایا گیا۔ یہ اور ان کی طرح سینکڑوں مجاہدوں کی مثالیں ہیں جنہوں نے راہِ حق میں باطل کی صفوں سے ٹکر لے کر نہیں پاش پاش کر دیا۔

ان حقیقت پسندوں نے تقیہ پر عمل نہیں کیا کیونکہ ان کے وقت کا یہی تقاضہ تھا۔ ان کے عدم تقیہ نے بقیہ حق کی حفاظت کر لی۔ اور اسلام کو معاویہ۔ یزید۔ زیاد اور ابن زیاد کے مذہب و مسلک سے ممتاز کر دیا۔

حُنین اور اصحابِ حُنین کے ماجرائے شہادت کو کون، بھول سکتا ہے؟ یہ شہیدوں کے قائد اور حریت پسندوں کے سربراہ تھے ہاں! ان بزرگوں کو جن حالات سے سابقہ تھا۔ ان کے پیشِ نظر یہ تقیہ کو حرام سمجھتے تھے۔ مگر کچھ وقت ایسے بھی آئے ہیں جب تقیہ پر عمل واجب اور بعض دفعہ اختیاری فعل تصور کیا گیا۔

خیال پڑتا ہے کہ بعض مرویات میں وارد ہوا ہے، کہ میلہ کذاب نے دو مسلمانوں کو گرفتار کر لیا۔ اور انہیں اپنی نبوت کی تصدیق اور آنحضرتؐ کی رسالت کی تکذیب پر مجبور



کیا۔ چنانچہ ان میں سے ایک نے تو اس کی خواہش مسترد کر دی  
نتیجہ قتل ہو گیا، مگر دوسرے نے اس کی بات پوری کر کے  
رہائی حاصل کر لی۔

یہ خبر جب ہر کار رسالت تک پہنچی تو حضرت نے فرمایا،  
”پہلے نے جنت کی راہ اختیار کرنے میں جلدی کی اور دوسرے نے  
ملت طلب کر لی! — دونوں میں سے ہر ایک کو اس کا اجر  
ملے گا۔“

مسلمانو! تقیہ کے بارے میں اپنے بھائیوں کو مطعون  
نہ کرو۔ خدا ہماری تمھاری عاقبت بخیر کرے، اور رشد و ہدایت  
کے نقطہ پر اتفاق نصیب ہو۔

والتلام علیکم ورحمة الله وبرکاته ۝

www.sirat-e-mustaqim.com